Regd. No- LW/NP/63
January . 2003

Fortnightly
Tameer-e-Hayat
Nadwatul Ulama, Lucknow-226 007

R.N.I. No- UP.URD/2001/60
Vol.2, Issue No: 1

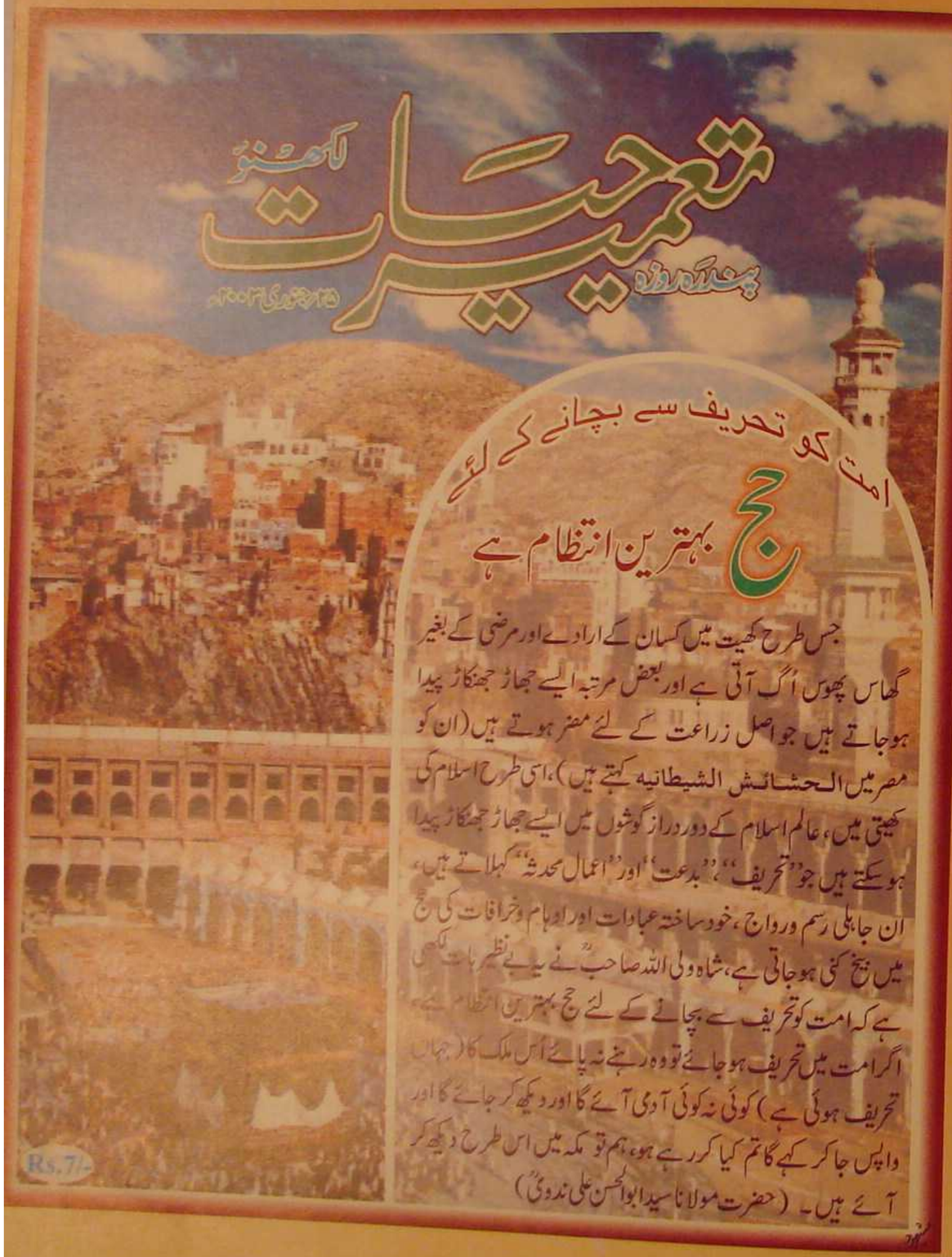

دنیائے علم وفن کا ایک شاہکار
طبی دنیا کی ایک اہم ضرورت
وصی میڈیکل ڈکشنری (انگریزی اردو)
(از۔ مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی)
جس میں علم طب کے ہر شعبہ سے متعلق امکانی لغات ومصطلحات (ترجمہ وتشریح کے ساتھ) بڑی عرق ریزی سے جمع کردئے گئے ہیں۔
ملنے کے پتے: (۱) مکتبہ فردوس۔ مکان نمبر ۲ (بردلیا) نیگور مارگ لکھنؤ (۲) مکتبہ ندویہ، پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ۔ ۱
رعایتی قیمت کے ساتھ دستیاب ہے۔

PH: 0547-520675
MOBILE: 9838059691
عوالی تیل
درد سے فوراً آرام
جوڑوں کے درد، چوٹ، موچ، زخم، جلنے، کٹنے، ورم، بچوں کے سردی لگ جانے میں مفید ہے۔
تیار کردہ
Girhast Chemicals Company
Maunath Bhanjan-MAU-275101 (U.P.)

Ph. Nos 260433-242946
جدید و دلکش سونے چاندی کے زیورات کے لئے
ہمارے شوروم میں
آپ کا خیر مقدم ہے
گہنہ پیلیس
Gahna Palace
حاجی عبدالرؤف خاں، حاجی محمد فہیم خاں محمد معروف خاں
ایک مینارہ مسجد کے سامنے اکبری گیٹ چوک لکھنؤ

طلباء اور تاجران کتب کے لئے خاص رعایت
تاج
اسلامک جنتری دستیاب ہے
طلب کریں۔ قیمت ۱۰/-
ہر قسم کے قرآن مجید مترجم، غیر مترجم، حمائل، قاعدے پارے، پنج سورے، عربی، فارسی، اردو کی درسی غیر درسی ہائی اسکول انٹر، جامعہ اردو علی گڑھ کی گائیڈ اور گیس پیپر وغیرہ بہترین اور مناسب قیمت میں ہم سے طلب کریں۔
نوٹ: آپ اپنی ضرورت کی کتب بذریعہ ڈاک بھی طلب کرسکتے ہیں۔
تاج بکڈپو، اکبری گیٹ، چوک لکھنؤ

چشمہ ساگر
ہمارے یہاں کمپیوٹر کے ذریعہ آنکھوں کی جانچ کی جاتی ہے۔
AUTO REFRECTO METER AR-860
فوٹو کرانک ہائی کوئنڈ لینس ہائی انڈیکس ریڈی لینس فینسی پادر اور چوب کے چشموں کا قابل اعتماد مرکز
ایک بار خدمت کا موقع دیں
آپٹیشین۔ اے۔ رحمٰن (علیگ)
شکر گنج کی مورتی کے نزدیک، معتبر گنج، اعظم گڑھ

ریڈی میڈ مردانہ ملبوسات کا قابل اعتماد مرکز
اعلیٰ کوالٹی۔ جدید ترین فیشن کے
Shirt, Trousers Coat Suits, Embroidered, Sherwanis, Pullowrre, Jackets, Kurta, Vastecoat suit, Night suits& ties
شادی بیاہ، تیوہار اور پارٹی کے موقع کے لئے شاندار ذخیرہ
تشریف لائیں
MEN MARK®
Men's Exclusive
58, Halwasia Market.
Hazratganj, Lucknow
Ph.: Shop:216948 Resi.: 227443

ہر قسم کی کھانسی نزلہ گلے کی خراش اور نزلے سے سر اور بدن درد میں لاجواب

Ph. Nos:- (Office)- 787250 (Ext.) 18, Guest House - 323864 Fax No- 0522-787310, 788376 thetameer-e-hayat@nadwatululama.org
Printed And Published by *Athar Husain* on behalf of Nadwatul Ulama at Parekh Press Tagore Marg, Lucknow-U.P.

مکہ مکرمہ میں

گنبد خضرا کو دیکھ کر

مجھ پر خدا کا بیشمار فضل وکرم ہے آج کل
لیل ونہار بار بار طوف حرم ہے آجکل

زمزم کا جام ہاتھ میں، ذکر خدا ہے ساتھ میں
میری نظر کے سامنے باب حرم ہے آجکل

تھامے ہوئے غلاف کو بہر دعا حطیم میں
ناچیز بندہ یہ ترا طالب کرم ہے آجکل

ذکرِ خدا زبان پر گرم طواف روز وشب
روکر چمٹنا بار بار بہر ملتزم ہے آجکل

اسود حجر کا چومنا ہے شغل میرا روز وشب
اور ہاتھ میرے ہیں بلند اور چشم نم ہے آجکل

شکر خدا ادا کرے مجھ سا نحیف وناتواں
مجھ پر تو فضل ایزدی بے کیف وکم ہے آجکل

رب العلا کے سامنے شام وسحر جبیں نیاز
بندہ ترا درِ حضور تسلیم خم ہے آجکل

تیرا کرم میں گن سکوں میرے لئے محال ہے
میرے خیال سے بلند ترا کرم ہے آجکل

میری دعا تو کر قبول آنا مرا نہ ہو فضول
لب پر دعا ہے تیز تر اور دم بدم ہے آجکل

ہاتف نے دی صدا مجھے کچھ غم نہ کر دل حزیں
تیرا مقام تو بلند بیت السلم ہے آجکل

دل غمزدہ میرا مسرور ہے آج
مرا دل محبت سے معمور ہے آج
میں قسمت پہ اپنی ہوں جتنا بھی نازاں
مری آنکھ دل مست ومخمور ہے آج

مری آرزو آج پوری ہوئی ہے
مرے سامنے قبۂ نور ہے آج
سکون وقرار آج رگ رگ بسا ہے
مرا سینہ تو وادی طور ہے آج

خدا کی ہے قدرت یہاں میں ہوں پہونچا
بلندی پہ یہ میرا مقدور ہے آج
ہے سرسبز وشاداب طیبہ کی وادی
جدھر دیکھیے نور ہی نور ہے آج

مولانا محمد ثانی حسنیؒ

پندرہ روزہ
تعمیر حیات
لکھنؤ
اشاعت کے ۴۰ ویں سال
جلد نمبر ۴۰ — شمارہ نمبر ۲
۲۵ر جنوری ۲۰۰۳ء مطابق ۲۰ ذیقعدہ ۱۴۲۳ھ

زیر سرپرستی:
حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

نگران خصوصی:
حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی
(معتمد تعلیم، ندوۃ العلماء لکھنؤ)
پروفیسر وصی احمد صدیقی
(معتمد مال، ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر عام
مولانا شمس الحق ندوی
معاون
ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی

رئیس التحریر
امین الدین شجاع الدین
معاون
محمود حسن حسنی ندوی

مجلس مشاورت
• مولانا نذر الحفیظ ندوی • مولانا عبداللہ حسنی ندوی
• مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری

زرتعاون
سالانہ ۱۵۰/- _____ فی شمارہ ۷/-
ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک ۳۵/- ڈالر
بیرونی ممالک بحری ڈاک _____ ۲۰/- ڈالر
ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات لکھنؤ کے نام سے بنائیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ
Tameer-e-Hayaat
Post Box. No- 93, Nadwatul Ulama Lucknow-226007
فون (دفتر) 18 2787250 (Ext) مہمان خانہ (0522)2323864
Website : www.nadwatululama.org
E-mail : nadwa@sancharnet.in
thetameer-e-hayat@nadwatululama.org

مضامین ومندرجات سے متعلق سارے امور میں رئیس التحریر سے خط وکتابت کی جائے اور انتظامی امور میں مدیر عام سے رجوع کریں۔

پروفیسر مشیر الحسن نے بارکیا آفسیٹ پرنٹنگ پریس، نیگر، مارگ لکھنؤ میں طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اداریہ		
جمہوری نظام میں ملت اسلامیہ کی حکمت عملی کیا ہو؟	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۳
تعلیم الحدیث		
حدیث نبوی۔ احتساب امت کی میزان	مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی	۵
اصلاح معاشرہ		
غیبت ہر برائی کی جڑ ہے	مولانا محمد حنیف ملی	۶
نذرانہ عقیدت		
میر کارواں	ڈاکٹر رضوان علی ندوی	۷
صہیونیت		
شمعدان کا قصہ کیا ہے؟	مولانا سلمان الحسینی	۱۴
عالم اسلام		
امریکہ، مشرق وسطی اور صدام حسین	مولانا نذر الحفیظ ندوی	۱۷
تکبیر مسلسل		
ایک مرد مومن کا صدقۂ جاریہ	روزنامہ صحافت	۱۹
گلشن شعروادب		
☆ کلیم عاجز کا مجموعۂ کلام		
"جلوۂ جاناں جاناں"۔۔ایک تعارف	ڈاکٹر محسن عثمانی	۲۰
☆ غزل	جگر مراد آبادی	۲۷
حکمت و موعظت		
حکمت ودور اندیشی کی ضرورت	مولانا شمس الحق ندوی	۲۳
تعلیم وتربیت		
نئی نسل ایک امانت ہے	مولانا سراج الدین ندوی	۲۵
گوشۂ خواتین		
شوہر کے حقوق اور ان کی اہمیت	عبدالرشید ندوی	۲۸
وفیات		
پروفیسر ضیاء الحسن ندوی کا سانحۂ وفات	ادارہ	۲۹
یاد یار مہرباں		
☆ مولانا سید ابوبکر حسنی آغوش، رحمت پروردگار میں	حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی	۳۰
☆ مولانا شہباز اصلاحی کی وفات	//	۳۱
آخری صفحہ		
پھر ہمیں اپنے آپ پر غصہ کیوں نہیں آتا؟	امین شجاع	۳۲

دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ اس شمارے کے ساتھ آپ کا زرتعاون ختم ہو چکا ہے، ازراہ کرم سالانہ زرتعاون ۱۵۰ روپے ارسال فرما کر ممنون کریں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رئیس التحریر کی میز سے

قارئین کرام!

تعمیر حیات کا یہ شمارہ تیاریوں کے آخری مرحلے میں تھا کہ پروفیسر ضیاء الحسن صاحب ندوی کے دفعتاً انتقال کی دلخراش اطلاع ملی۔ مرحوم، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں آرٹس فیکلٹی کے ڈین کے باوقار منصب پر فائز تھے۔ ۲۰ جنوری دوشنبہ کے دن جامعہ جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ دم واپسیں آگیا اور پروفیسر مرحوم (کہ جن کے لبوں پہ ہمہ وقت ایک دلنواز مسکراہٹ کھیلا کرتی تھی) کے سانحۂ وفات نے ہم سب کو ملول و مغموم کر دیا۔ لیکن یہ شفیق معلم اپنی وفات کے عنوان سے دنیا سے جاتے جاتے بھی یہ سبق دے گیا کہ انسان موت سے کبھی غافل نہ رہے، نہ جانے کس موڑ پر زندگی کی شام ہو جائے۔ مرحوم "نرم دم گفتگو گرم دم جستجو" کی تصویر تھے اور شرافت و مروت ان کے چہرہ سے ٹپکتی تھی۔ ان کی یادوں کے اجالے اس لائق ہیں کہ ان کا تذکرہ کیا جائے اور ان سے روشنی حاصل کی جائے۔

اوائل جنوری میں ندوہ میں دینی تعلیمی کونسل کے سکریٹری ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی کی مرتب کردہ کتاب "تکبیر مسلسل" کا اجراء ایک باوقار تقریب میں عمل میں آیا۔ دینی تعلیمی کونسل حضرت مولانا علی میاںؒ کے مشن کا ایک روشن پہلو ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ مولانا کو اس فکر نے عمر بھر بے چین و بے قرار رکھا تھا کہ کہیں مسلمان نسل نو کے ایمان و عقیدہ کی طرف سے غافل نہ ہو جائیں۔ دینی تعلیمی کونسل کی تشکیل اور اس کو ایک تحریک بنا دینے کے پس پشت یہی سوز دروں کام کر رہا تھا۔ ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی ہم سب کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ موصوف نے اس تالیف کے ذریعہ اس سوز دروں کو عام کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی۔ اس شمارے میں "تکبیر مسلسل" سے متعلق ایک روزنامہ کا اداریہ نقل کیا جا رہا ہے تاکہ اس کتاب کے تعارف اور اس کی افادیت کے ساتھ ساتھ اس دینی تعلیمی تحریک کے پس منظر اور خدمات سے بھی واقفیت حاصل ہو سکے۔ اس لئے بھی کہ موجودہ حالات گزشتہ دہائیوں کے مقابلہ میں زیادہ سخت ہیں اور اس لحاظ سے فکر و عمل کی ضرورت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔۔۔ اس فکر و عمل کی ضرورت کا احساس آپ کو اس شمارے میں شامل ایک مضمون "جلوۂ جاناں جاناں" کے مطالعہ کے ذریعہ بھی ہوگا۔ جس میں ذکر ہے حضرت کلیم عاجز کے کلام کا اور "انداز بیاں" ہے جناب محسن عثمانی کا !! ہمیں مسرت ہے کہ اس شمارے میں معروف محقق و عالم ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی کا حضرت مفکر اسلام پر سپرد قلم کیا ہوا ایک گرانقدر مضمون بھی شامل ہے۔ حضرت مولانا سے ڈاکٹر صاحب کے نیاز مندانہ تعلق کی داستان ۵۳ برسوں پر محیط ہے۔۔۔ طویل وقفہ کے بعد قارئین کو اس شمارہ میں مخدوم و مربی مولانا عبداللہ عباس ندوی کی تازہ تحریر دیکھنے کو ملے گی۔ جو انشاء اللہ نگاہ شوق سے پڑھی جائے گی اگرچہ "یادیار مہرباں" کے عنوان سے لکھی گئی یہ تحریر مولانا ابوبکر سنی اور مولانا شہباز اصلاحی کی یاد دلا کر آنکھوں کو نم بھی کر دے گی۔۔۔ اس شمارہ کا اداریہ بھی حضرت ناظم ندوۃ العلماء ہی کے قلم سے ہے۔ یوم جمہوریہ کے موقع پر مسلمانوں کیلئے لمحۂ فکریہ ہے کہ اس ملک میں ان کی حکمت عملی کیا ہو جس کی بدولت وہ ایک باوقار اور آبرومندانہ زندگی گزار سکیں حضرت والا کے اداریہ میں ان تدابیر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ امید یکہ مزاج بخیر ہونگے۔ والسلام

سلمان حسینی

دستک

تربیت یافتہ جنون اور اسکا علاج

ایک عام شخص سے کوئی پوچھے کہ جنون کیا ہوتا ہے تو اس کا سیدھا سا جواب ہوگا کہ جب کسی کا دماغ ماؤف ہو جائے، عقل جواب دے جائے اور بے سروپا حرکتیں اس سے سرزد ہونے لگیں تو سمجھا جائے گا کہ اسے جنون ہو گیا ہے۔۔۔ لیکن جنون کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس کو وجود میں لانے کے لئے دماغ کی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کی جاتیں اور جس کو پروان چڑھانے کے لئے ہزاروں جتن کئے جاتے ہیں۔ جنون کی یہ وہ قسم ہے جو تعصب و عداوت کی کوکھ سے جنم لیتی اور نفرت کی غذا کھا کر جوان ہوتی ہے۔ اس کے رکھوالے اس جنون کے پیدا کرنے، اس کے باقی رہنے، پھلنے پھولنے اور ایک سے دوسرے میں منتقل ہونے کی فکر بھی کرتے ہیں اور اس طرح یہ جنون۔۔۔ "تربیت یافتہ جنون" بن جاتا ہے۔ اس کو تقویت پہونچانے کے لئے تاریخ، مذہب، ثقافت سب کی دُہائی دی جاتی ہے اور اسے ایک فلسفہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

ایسے ہی "تربیت یافتہ جنون" کی ذہنیت ہوتی ہے جو اپنے حامل سے انا ربکم الاعلیٰ کی صدا لگواتی ہے اور دنیا سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہر صحیح و غلط میں اس کی ہاں میں ہاں ملائی جائے اور اگر اس کے خلاف انصاف پسندو حقیقت بیں کچھ کہنا یا کرنا چاہیں تو ایسے "تربیت یافتہ" اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیتے ہیں اور حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔۔۔ ان دنوں عالمی سیاست کے افق پر امکانی جنگ کے خلاف مظاہروں کو اسکی ایک مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔۔۔ امکانی جنگ کے خلاف یہ مظاہرے مستحسن اور قابلِ قدر۔۔۔ لیکن یہ تدبیر عارضی اور وقتی ہے جبکہ مستحکم اور پائیدار علاج یہ ہے کہ انسانی و اخلاقی قدروں کے علمبردار "فکر مندی اور صف بندی" کا عملی مظاہرہ کریں، "خود شناسی اور خدا شناسی" سے کام لیں اور دنیا میں کانٹے بچھانے والوں کی صرف ملامت نہ کریں بلکہ دنیا میں پھول بچھا دینے کا کام بھی واقعی کر گزریں اس طرح "تربیت یافتہ جنون" کے مقابلے میں "عشق" کو لا کھڑا کریں۔۔۔ ورنہ مستقبل کا مؤرخ لکھے گا کہ تخریب گلستاں کیلئے "جنون" تو سر گرم و متحرک تھا، لیکن تعمیر گلستاں کا نغمہ چھیڑنے والوں نے سرد مہری اور کمزوری دکھائی تھی اور ان میں اپنے مقصد سے "عشق" میں کمی پائی جاتی تھی۔

(امین شجاع)

اداریہ

جمہوری نظام میں ملت اسلامیہ کی حکمت عملی کیا ہو؟

(حضرت مولانا) سید محمد رابع حسنی ندوی

جمہوری نظام میں ملک کے تمام باشندوں کو انسانی حقوق میں برابری حاصل ہوتی ہے اور ملک کا دستور اس کی ضمانت دیتا ہے، عدالت اس کا کنٹرول کرتی ہے اور اس سلسلے میں اکثریتی اور اقلیتی افراد دونوں کو یکساں حیثیت حاصل رہتی ہے لیکن اس کا نفاذ خود اکثریت و اقلیت کے افراد کی فکر و توجہ کے مطابق ہی عمل میں آتا ہے۔ اکثریت کے افراد کو اپنی اکثریت کی بنیاد پر نظام حکومت میں نسبتاً برتری حاصل ہوتی ہے۔ اس برتری کی بنا پر ثقافتی و اقتصادی حقوق کو زیادہ بہتر طریقہ سے حاصل کرنے کا ان کو زیادہ موقع حاصل ہو جاتا ہے۔ جس کی بنا پر اقلیت کے افراد کو کمی سے سابقہ پڑتا ہے لیکن اس کمی کو اگر قانونی بنیاد پر وہ دور نہ کرا سکتے ہوں تو اسکو اپنی نجی تدبیروں نیز توجہ اور فکر مندی سے پورا کر سکتے ہیں۔ دنیا کی بیدار مغز اور حوصلہ مند اقلیتیں اس ضرورت کو محسوس کرتی ہیں اور اپنی ملت کی ضرورتوں کے لئے اپنے نجی غیر حکومتی ذرائع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرگرم عمل ہوتی ہیں۔ اور اپنی اس ہوش مندی سے اکثریت کے مقابلے میں پیچھے نہیں رہتیں، بلکہ بعض وقت آگے بڑھ جاتی ہیں اس کی مثالیں عہد حاضر میں بھی مختلف ملکوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی اقلیت حالات کا صحیح جائزہ لینے میں کوتاہی کرتی ہے اور اس کے رہنما حقیقت پسندی سے دور اور ذمہ داروں کی ظاہر داریوں پر اعتماد کر لینے والے اور حالات کے مطابق طرز عمل اختیار نہ کرنے والے ہوتے ہیں تو اقلیت اپنی ملکی اور انسانی حقوق کے حصول میں بے توجہی کا شکار ہوتی ہیں اور اکثریت کے مقابلہ میں پیچھے چلی جاتی ہیں۔ ہندوستان بھی ان ملکوں میں ہے جہاں اکثریت و اقلیت کا معاملہ توجہ چاہتا ہے، یہاں مسلمان قابل ذکر اقلیت میں ہیں اور یہ اقلیت معمولی نہیں بلکہ بڑی اقلیت ہے۔ جس کی اپنی مذہبی، تہذیبی اور سماجی قدریں ہیں اور یہ قدریں ایسی ہیں کہ ان سے دست بردار نہیں ہوا جا سکتا۔ وہ کوئی محدود یا مقامی حیثیت کی سماجی اکائی نہیں ہیں کہ اپنے اردگرد کے ماحول میں ضم ہو جائیں، وہ اپنی وسیع اور بین الاقوامی برادری رکھتے ہیں، جس سے ان کے مذہبی اور اخلاقی طور پر بنیادی روابط ہیں وہ اپنی اس برادری سے بالکل بے تعلق نہیں ہو سکتے اور انھوں نے اپنی ماضی کی تاریخ میں جو مخصوص علمی و تہذیبی ورثہ پایا ہے اس سے بھی دستبردار نہیں ہو سکتے لیکن مقامی لحاظ سے وہ ملک کی اکثریت کے ساتھ ہیں جو وطنی وابستگی رکھتے ہیں اور ملک کا جو مشترک دستور ہے وہ اس کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کے پوری طرح پابند ہیں۔ لہٰذا دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم کو ملک کا دستور جو حقوق دیتا ہے ان کو ہم جمہوری اصولوں کے مطابق کس طرح حاصل کر سکتے ہیں اور ہماری ضرورت کی تکمیل میں جو کمی ہوتی ہو اس کو ہم کس طرح دور کر سکتے ہیں۔

ہماری سب سے بڑی ضرورت ملک کے اندر اپنی باعزت زندگی قائم کرنے اور اس کو بہتر بنانے اور ترقی کی موجودہ دوڑ میں

پیچھے نہ رہنے کے لئے جو امکانات اور وسائل ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کی ہے۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ اس میں ہماری صورت حال کیا ہے اور ہم کو کیا کرنا ہے۔ حصول آزادی کے بعد ملک ترقی کے راستہ میں ہے ہم کو دیکھنا ہے کہ اس میں ہمارا کیا حصہ ہے اور ترقی کے حصول اور قومی واخلاقی زندگی میں بہتر صورت حال حاصل کرنے میں ہمارا کیا مقام ہے حقیقت احوال کے سلسلہ میں ہم کو سنجیدہ اور تعمیری انداز کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں صرف حق تلفی کرنے والوں کے خلاف محض آواز اٹھانے سے مسئلہ بہت کم حل ہوتا ہے آواز اٹھانا غلط نہیں ہے البتہ اس سے زیادہ ٹھوس عملی کوششوں کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ہم کو تعلیم کے نجی ذرائع اور ذرائع ابلاغ کا بھر پور استعمال اور ہم وطنوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا کرنے والی غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کرنا چاہئے، اس وقت ملک کے اندر شکوہ و شکایت، خود غرضیوں اور فرقہ وارانہ ٹکراؤ کا جو ماحول بن گیا ہے اسکو ہم مذکورہ بالا طریقوں سے بہت حد تک دور کر سکتے ہیں اور اس کے ذریعہ ہم اپنے جمہوری اور وطنی حقوق کو زیادہ بہتر طریقہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اس وقت مسلمانوں کو سب سے زیادہ جس چیلنج کا سامنا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے مذہبی اور ملی تشخص کو مٹانے اور ان کے تاریخی کردار کو بگاڑ کر پیش کرتے ہوئے ان کو ایک تشدد پسند ملت قرار دیا جارہا ہے اور اس سلسلہ میں ان کی تاریخی اور مذہبی یادگاروں و آثار قدیمہ کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔

ضرورت ہے کہ ہم ان کوششوں کو ناکام بنانے کیلئے ایک طرف ذرائع ابلاغ کو مؤثر ڈھنگ سے اختیار کریں اور دوسری طرف ادبی وثقافتی سیمیناروں اور اخلاقی ملاقاتوں اور گفتگو کے ذرائع سے بھی کام لیں۔ اس سے کم از کم معاندانہ مقصد نہ رکھنے والے ذہنوں کی غلط فہمیاں دور کی جاسکتی ہیں۔ کوئی بھی قوم ہو اس میں معتدل سوچ رکھنے والوں ہی کی اکثریت ہوتی ہے جن کو صورت حال سے نہ صرف واقف کرایا جاسکتا ہے بلکہ ہم نوا بنایا جاسکتا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ معاندانہ ذہنیت کی کارفرمائی کا مقابلہ قانونی ذرائع سے بھی کیا جاسکتا ہے اس طریقہ کار کا فائدہ ان کے خلاف محاذ آرائی اور ٹکراؤ کے طریقوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے کیوں کہ رائج الوقت ٹکراؤ فریق مخالف میں بھی ٹکراؤ اور جوش پیدا کر دیتا ہے اور چونکہ اقلیت واکثریت کے مابین جو تناسب ہے اس سے وہ مسلمانوں کے حق میں نہیں جاتا لہٰذا مسلمان نقصان اٹھاتے ہیں۔

مذکورہ بالا تدابیر کے پہلو کو اختیار کرنے کے ساتھ رضائے الٰہی کے حصول کے پہلو کی طرف بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ حرام مال اور ناجائز اعمال میں آلودگی مسلمانوں کے معاشرہ میں بہت عام ہوگئی ہے۔ اس کو بدلنے کی طرف پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ قومی اور انفرادی دونوں طرح سے حالات خدا کے علم واختیار کے دائرہ میں ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی اس کی رضا کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

☆☆☆

حدیث نبویؐ

احتساب امت کی میزان

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

اسلامی کلچر کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث۔ یہ دو وہ آہنی ستون ہیں جن پر پوری اسلامی تہذیب وثقافت کی عمارت قائم ہے۔ اسلامی تہذیب صرف ظاہری عادات واخلاق کا نام نہیں بلکہ وہ پورا ایک نظام حیات ہے جس میں پورے توازن کے ساتھ زندگی گذارنے کا طریقہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ اسلامی مزاج کی سب سے اہم خصوصیت اور اس کا نمایاں امتیاز ہے کہ اسکے مختلف عناصر اس کے قالب میں پورے توازن کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور جس چیز کا جو خانہ شریعت اسلامیہ میں متعین کیا گیا ہے وہ چیز اس سے کم ہے نہ زیادہ، یہی انسانیت کی معراج ہے اور یہی اسلامی مزاج کا صحیح پیمانہ۔ اگر کوئی بھی چیز اپنے حجم سے بڑھ جائے تو اس سے اسلامی مزاج میں بگاڑ پیدا ہونے لگتا ہے اور پھر اسلام کی حقیقی تصویر نگاہوں سے اوجھل ہونے لگتی ہے۔

یہ اسلامی مزاج اپنے پورے توازن کے ساتھ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں نمایاں ہے جن کے بارے میں قرآن مجید میں کہہ دیا گیا ہے کہ "ولکم فی رسول اللہ أسوۃ حسنۃ" تمہارے لئے اللہ کے رسول کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے۔

اسلام کی صحیح تصویر سامنے لانے کیلئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ان میں اگر کسی ایک سے بھی پہلو تہی کی گئی تو اسلام کی نہایت نامکمل اور ناقص تصویر نگاہوں کے سامنے آئے گی اور واقعہ تو یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر وتوضیح حدیث کے بغیر ناممکن ہے اس کے علاوہ بھی دین کا بڑا حصہ ہم کو حدیث ہی سے معلوم ہوتا ہے، اور حدیث بھی حقیقت میں وحی کا ہی ایک حصہ ہے۔ قرآن مجید میں صاف صاف کہہ دیا گیا "وما ینطق عن الھوی إن ھو إلا وحی یوحی" کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جی سے کچھ نہیں فرماتے آپ تو جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ وحی ہے جو آپ پر ہوتی ہے۔

یہ آپ ﷺ کا اعجاز ہے کہ آپ کی زبان مبارک سے ایسے الفاظ نکلے جن میں ہر جگہ اور ہر دور کیلئے پوری غذا موجود ہے نت نئے پیدا ہونے والے مسائل کا اس میں حل بھی ہے اور انسانی نفسیات (Psychology) کو سامنے رکھتے ہوئے معاشرہ کے امراض کی تشخیص بھی ہے اور اس کی دوا بھی۔

پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک دنیائے اسلام کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ جس ملک میں حدیث سے اشتغال کیا گیا اور اس کو رواج دیا گیا اور عبادات ہی کی حد تک نہیں بلکہ معاشرت اور آپسی معاملات میں اس کو حکم بنایا گیا وہاں بدعات ورسومات نہیں پنپ سکیں اور ان کی بیخ کنی ہوتی رہی، اور جہاں حدیث سے دوری رہی وہاں مختلف قسم کے فتنے پیدا ہوتے رہے۔ کہیں "اہل قرآن" نے سر اٹھایا اور سرے سے حدیث ہی کا انکار کر دیا، کہیں مختلف بدعات وخرافات زور پکڑنے لگیں اور ان پر کوئی نکیر کرنے والا نہ رہا۔

حدیث ہی احتساب امت کی ایسی طاقتور میزان ہے کہ جس سے اسلام کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے اور جہاں بھی کمی یا زیادتی ہو فوراً نمایاں ہوجاتی ہے، اور اس کی کانٹ چھانٹ حدیث ہی کی روشنی میں ممکن ہے اس لئے کہ دین کا بڑا حصہ ہم کو حدیث ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا اور حقیقت میں یہ خطاب ساری امت کو ہے اور قیامت تک کیلئے ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ترجمہ: حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں ہرگز تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ آرام سے گاؤ تکیہ پر ٹیک لگائے بیٹھا ہو اور جب میرے ارشادات اس کے پاس پہونچیں خواہ مامورات ہوں یا منہیات۔ تو کہنے لگے ہم نہیں جانتے ہم تو بس جو کتاب اللہ میں ہے اس کی اتباع کریں گے۔

بعض روایتوں میں جو ابوداؤد کی ہیں یہ اضافہ بھی ہے کہ جتنے احکامات کتاب اللہ میں ہیں اتنے ہی یا اس سے زیادہ احادیث میں ہیں۔

اس روایت سے امت کو اس ذمہ داری کا احساس دلایا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر جگہ حدیث نبوی سے وابستگی رکھے اور اپنی زندگی کا سفر اسی کی روشنی میں طے کرے۔

❁❁❁❁❁

اصلاحِ معاشرہ

غیبت ہر برائی کی جڑ ہے

مولانا محمد حنیف ملّی

قال النبی ﷺ : لا یدخل الجنة قتات (الحدیث)

(ارشادِ نبویؐ ہے کہ چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔)

مذکورہ حدیث کی روشنی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی امت پر رحم کھانے والے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اتنا خیال نہیں فرمایا جتنا امت کا۔ کہ ایک جگہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ بس ایسا سمجھو کہ صاحبِ خانہ جس طرح شمع پر پروانوں کو گرنے سے روکتا ہے اسی طرح میں تمہارا کمر بند پکڑ کر جہنم سے دور کرتا ہوں اور تم ہو کہ زبردستی جہنم میں گرتے جارہے ہو۔

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں آپ جہنم اور اس کی ہولناکیوں کا موثر انداز میں ذکر کرکے امت کو نہ ڈراتے ہوں آپؐ نے عمل کا شوق دلانے کے لئے جنت اور اس کی رعنائیوں کا ذکر بھی فرمایا ہے۔

اس روایت میں بھی چغلی جیسے گھناؤنے اور نقصان دہ عمل سے بچانے کے لیے فرمایا ہے کہ چغل خور جنت میں نہیں جائے گا جب کہ ایک مسلمان کی آخری خواہش اور منزل جنت ہے اور دنیا اس کے لیے فریب کی ٹٹی ہے۔

جنت ہر مسلمان کی خواہش ہے جو ایمان کے بعد اعمال صالحہ کے ذریعہ ملتی ہے اور بداعمالیوں سے چھن جاتی ہے عمل ہی سے جنت اور جہنم ملتی ہے حضور ﷺ نے اپنے پاک ارشاد میں

> حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں آپ جہنم اور اس کی ہولناکیوں کا موثر انداز میں ذکر کرکے امت کو نہ ڈراتے ہوں۔ آپؐ نے عمل کا شوق دلانے کے لئے جنت اور اس کی رعنائیوں کا ذکر بھی فرمایا ہے۔

ایک اصولی بات بتادی ہے۔ آپ کا فرمان ہے :

"لا یدخل الجنة سیئی الملکة"

بدخو جنت میں نہیں جائے گا۔

لیکن بری عادتوں میں درجے قائم ہیں بعض برائیاں اتنی گھناؤنی ہیں کہ ان کا تعفن میلوں جاتا ہے اور معمولی شائستہ رکھنے والا انسان بھی اس سے حد سے زیادہ نفرت کرتا ہے تو قدسیاں اور فرشتے اس کے پاس کیسے آئیں گے۔ یہ برائی جس مجلس میں ہوتی ہے اس کا تعب وتاب اور خیر وبرکت رخصت ہوجاتی ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جس مجلس میں غیبت ہو وہ سب سے زیادہ محروم اور بے فیض ہوتی ہے شیخ اکبرؒ نے ایک مجلس سے فرمایا کہ: اپنی مجلسوں کو فرشتوں کے لیے قابلِ رشک بنانا ہو اور ان کی شرکت سے محظوظ ہونا ہو تو اسے چغلی اور غیبت سے بچاؤ۔

حضرت ابراہیم ادہمؒ مجلسوں پر مٹی ڈال کر چلے آتے تھے اور فرماتے تھے کہ ایسے لوگ ہلاک ہوں جو غیبت سنتے ہیں اور خدا سے اس کوتاہی پر ذرا نہیں ڈرتے۔

حضرت ابن مبارکؒ فرماتے ہیں :

النمیمة رأس کل شتیمة

(غیبت ہر برائی کی جڑ ہے) برائی اگر جڑ پکڑ جائے تو پھر نیکیوں کا درخت بے برگ وبار اور خزاں رسیدہ ہوجائے گا اس لیے اپنی خلوت اور جلوت کو غیبت اور چغلی سے بچائے رکھئے۔

قرآن کریم نے بھی چغلی کی نفرت دلوں میں بٹھانے کے لیے بڑا موثر اسلوب اختیار کیا ہے ارشاد ہے :

ولا یغتب بعضکم بعضاً ایحبّ أحدکم ان یاکل لحم اخیه میتاً فکرهتموه۔

(تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا کوئی اپنے مردار بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا۔ ہرگز نہیں کرے گا) یعنی جس طرح مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے مردے کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ایسے ہی جس کی غیبت کی جاتی ہے جب تک اسے خبر نہ ہو کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور یہ کون سی دانائی ہے کہ جسے تم تکلیف پہنچانا چاہتے ہو وہ بالکل محفوظ ہو اس سے تو غیبت کرنے والے کی دناءت اور حماقت سمجھ میں آتی ہے بلکہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا بھلا کہنا پرلے درجہ کی بزدلی ہے قرآنی کے حوالے سے یہ حدیث بھی موجود ہے آپ کا ارشاد ہے :

لا تغتابوا المسلمین ولا تتبعوا عوراتهم

''مسلمانوں کی نہ غیبت کرو اور نہ ان کے عیوب کی جستجو کرو''

قربان جائیے اللہ کے نبی ﷺ کی رحمت ورافت پر۔ کوئی اندازہ کرسکتا ہے آپ کی مہربان ذات کا کہ آپ بتانا (باقی صفحہ ۱۸ پر)

میر کارواں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

چند یادیں

پروفیسر سید رضوان علی ندوی
پی۔ ایچ۔ ڈی (کیمبرج)

وہ میرِ کارواں جو اپنی بلند نگاہ، دل نواز سخن اور پرسوز جاں سے نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ مسلمانانِ عالم کو نصف صدی تک راہِ ہدایت دکھاتا رہا، ان کے دماغوں میں روشنیٔ علم اور دلوں میں حرارتِ ایمانی پیدا کرتا رہا، وہ بالآخر ۲۲ر رمضان ۱۴۲۰ھ بروز جمعۃ الوداع (۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء) تلاوت قرآن کرتے ہوئے اپنے مالکِ حقیقی سے جاملا۔ **یا أیتها النفس المطمئنة، إرجعی إلی ربّك راضیةً مرضیةً۔**

خادم خاص بھائی عبدالرزاق کے قول کے مطابق حضرت مولانا غسل جمعہ فرما کر اور نئے کپڑے زیب تن کرکے نماز جمعہ کے لیے تیار تھے، اور حسب عادت سورۂ کہف کی تلاوت فرمانے کا ارادہ تھا، لیکن اس روز اس کے بجائے سورۂ یٰسٓ کی تلاوت شروع کی، اور گیارھویں آیت کا بشارتِ خداوندی کا قرآنی جملہ **فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَ اَجْرٍ کَرِیْمٍ**، زبان پر آیا تھا کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ یا بنص قرآنی **کذلك یجزی اللّٰه المُتّقین ☆ الذین تتوفّٰهم الملائکة طیّبین یقولون سلام علیکم ادخلو الجنة بما کنتم تعملون ☆** فرشتوں نے سلام کرتے ہوئے اس متقی قافلہ سالار کی روح کا استقبال کیا اور جنت میں داخلے کی دعوت دی۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

مولانا مرحوم کی زندگی اور موت **طاب حیاً و طاب میتاً** کا مصداق تھی۔

راقم سطور اپنے آپ کو انتہائی خوش نصیب سمجھتا ہے کہ آج سے ۵۳ سال قبل جب اس کی زندگی ۱۹ سال کی عمر میں ایک نئے مبارک موڑ سے دوچار ہوئی، تو اس نے مولانا مرحوم کا ہاتھ پکڑا یا یوں سمجھئے کہ مولانا مرحوم کے دستِ شفقت نے ایک لاابالی نوجوان کو سہارا دیا، کچھ بھی ہو، میرا اپنا حال یہ تھا ''تراہا تھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے''۔ اس اجمال کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے، میرے بھائی سید واجد علی کے ندوہ کے ایک دوست محمد علی اخگر مشتاق ملیح آباد سے ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ رام پور آئے تھے، یہ تقسیم کے کچھ ہی ماہ بعد غالباً اکتوبر یا نومبر کی بات ہے، وہ ہمارے گھر اپنے دوست سے ملنے آئے تھے اور انھوں نے بھائی صاحب کے ساتھ مجھے بھی دعوت دی کہ دوسرے روز بعد مغرب رام پور کی ایک مسجد میں ایک جلسے میں آئیں، جہاں میں نے حضرت مولانا مرحوم اور مولانا محمد منظور نعمانی مرحوم کی دو تقاریر سنیں، دل نے اثر قبول کیا، تین روز کے سفر کے لئے جب نام طلب کئے گئے تو میں نے بھی اپنا نام لکھوادیا، اور دوسرے روز تبلیغی جماعت والوں کے دستور کے مطابق ایک مختصر بستر بغل میں لے کر ساتھ ہوگیا، پہلی منزل مرادآباد کی تھی، یہ لکھنا بھول گیا کہ میں ان دنوں رام پور کے حامد ہائی اسکول میں ایک سالہ تدریسی ملازمت کرنے کے بعد فارغ تھا۔

مرادآباد میں بادشاہی مدرسہ کے مہتمم یا صدر مدرس مولانا عبدالحق صاحب مدنی سے ان دو بزرگوں اور تبلیغی مسافروں کی ملاقات کے وقت یہ نوگرفتار مسافر بھی موجود تھا۔ غالباً ایک رات وہاں گزاری اور دوسرے روز سہارن پور روانگی تھی، جہاں شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی، یاد پڑتا ہے کہ اس نوجوان غیر مولوی ''نوگرفتار'' کا تعارف بھی کرایا گیا، اور پھر مدرسہ مظاہر العلوم کے ایک محترم اور بزرگ استاد مولانا مفتی اسعد اللہ صاحب رام پوری سے مولانا مرحوم کی معیت میں نیاز حاصل ہوا، مفتی صاحب نے رام پور کے تعلق سے خصوصی شفقت فرمائی، اور دوسرے روز جمعہ کو بعد نماز اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا، اور ساتھ ہی ہدایت فرمائی کہ نماز جمعہ سے قبل صلاۃ التسبیح پڑھوں، اس کا طریقہ بھی بتایا، زندگی میں پہلی مرتبہ یہ نماز پڑھی، اور مفتی اسعد اللہ صاحب مرحوم کی رہائش گاہ پر دوپہر کا کھانا کھایا اور زندگی میں پہلی مرتبہ جَو کی روٹی کھائی، غالباً اسی سفر میں صوفی عبدالرب صاحب ایم اے خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی سہارنپور براہ راست آگئے تھے۔

اس مبارک اور انقلاب آفریں سفر کی ایک یاد و باتیں مجھے اب تک بخوبی یاد ہیں، ایک تو یہ کہ استاذی ومرشدی حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ، مولانا محمد منظور نعمانی اور صوفی صاحب سے یہ فرماتے تھے کہ ''یہ رضوان صاحب تو **ربّنا إنّنا سمعنا منادیاً ینادی للایمان ان آمنوا بربکم فآمنّا** کی تصویر ہیں، میں چونکہ حافظ قرآن تھا اس لئے یہ آیت دماغ میں فوراً ثبت ہوگئی، دوسرے یہ کہ اس موقعہ پر مرحوم صوفی عبدالرب صاحب

نے مجھے دو روپیہ (جو نصف صدی سے زائد قبل آج کے غالباً پچاس ساٹھ یا سو روپے کے برابر تھے) پیش کئے، جس پر میری آنکھوں میں انکار کے ساتھ آنسو آ گئے کہ مجھے خیرات دی جارہی ہے، مولانا محمد منظور نعمانی مرحوم بھی ساتھ ہی کھڑے تھے، انھوں نے بھانپ لیا اور فرمایا آپ روہانسا نہ ہوں، یہ تو ہدیہ ہے، اور ہدیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا ہے، اور قبول کرنے کی تلقین کی ہے، چنانچہ میں نے ایک بزرگ کا ہدیہ اس وضاحت کے بعد قبول کرلیا۔

میں اسے اپنی خوش نصیبی اور توفیق الٰہی سمجھتا ہوں کہ میری طبیعت کا میلان اپنے مولانا کی طرف زیادہ ہوا، کچھ مختصر مراسلت ہوئی، میں نے عربی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی، اس زمانے میں لکھنؤ میں مرحوم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی اور حضرت مولانا مرحوم نے ایک تعلیمی ادارہ تعلیمات اسلام کے نام سے قائم کیا تھا۔ جو امین آباد ہی میں ایک عمارت کی اوپر کی منزل میں تھا، استاد محترم مرحوم مولانا عبدالسلام صاحب نے اس ادارے میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو عربی سکھانے کے لئے ایک مخصوص کورس ترتیب دیا تھا، اس میں قرآن کریم کو ضروری صرف و نحو سکھانے اور پھر عبارت پڑھنے کے لئے بنیاد بنایا گیا تھا۔ ''عربی کے دس سبق'' پہلی ابتدائی کتاب تھی، اس کے بعد قرآن کی پہلی اور دوسری اور تیسری کتاب، یہ انگریزی ریڈرس کے طریقے پر مرتب کی گئی تھیں۔ تین ماہ کا کورس تھا، میں والدین سے اجازت لے کر حضرت مولانا علی میاںؒ کے مشورے سے لکھنؤ آ گیا اور اس ادارے سے منسلک ہوگیا، میرے ساتھ دو صاحبان اور اس کورس میں اسی وقت شریک ہوئے، ایک فرخ آباد کے عبدالجلیل صاحب جو انٹرنس پاس تھے اور جماعت اسلامی سے وابستہ تھے اور دوسرے غالباً نسیم صاحب جو میٹرک پاس تھے اور بستی کے رہنے والے، یہ دونوں جہاں تک یاد پڑتا ہے عمر میں مجھ سے کسی قدر بڑے تھے۔ میری یہ انتہائی سعادت تھی اور میرے ساتھیوں کی بھی کہ ہم نے عربی کے درس سبق کی ابتدا مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کے ساتھ کی۔ اب یاد نہیں کہ یہ چھوٹی سی مفید و مبارک کتاب ساری ان سے پڑھی تھی یا ان کے شاگرد و رفقاء مولانا عبدالغفار صاحب (جماعت اسلامی لکھنؤ کے امیر) اور مولوی احتشام الحق سے بھی اس کتاب کا کچھ حصہ پڑھا تھا، بہر حال میں نے یہ کورس پورا کیا، اور اس طرح مجھے اچھی خاصی عربی آ گئی تھی، حضرت مولانا مرحوم میری رفتارِ ترقی (Progress) سے بہت مطمئن تھے، ادارۂ تعلیمات اسلام ہی میں مولانا مرحوم کا ہفتہ وار درس قرآن (غالباً ہر منگل کو) بعد مغرب ہوتا تھا، جس میں شہر کا ماڈرن تعلیم یافتہ طبقہ، وکلاء، انجینئرس، گورنمنٹ ملازمین اور تجار شرکت کرتے تھے، میں بھی پابندی سے اس میں شریک ہوتا تھا۔

اس کورس کے کامیابی کے ساتھ خاتمے پر میری خواہش ہوئی کہ ندوہ میں داخلہ مل جائے میری سابقہ ڈگری کی بدولت مجھے درجہ پنجم (عالمیت) میں داخلہ مل گیا، حضرت مولانا مرحوم کی عنایت سے میرا ماہانہ وظیفہ بھی مقرر ہوگیا، جو تیس روپیہ ماہانہ تھا اور یہ میں مطبخ کو کھانے کے لئے دیدیتا تھا، ان برسوں میں مولانا مرحوم پر تبلیغ کا ذوق وشوق بہت غضب کا تھا اور ندوہ کی تعلیمی سرگرمیوں کی طرف توجہ کم تھی ان دنوں بارہ بنکی، اناؤ وغیرہ تبلیغی جماعتوں میں طلبہ کی جماعت کے ساتھ گیا، یہ ۱۹۴۸-۱۹۴۹ کا تعلیمی سال تھا، مولانا مرحوم زیادہ تر سفروں میں رہتے تھے ایک سبجیکٹ ''مضامین قرآن'' حضرت مولانا مرحوم کے پاس تھا، جو تین وقفوں میں شاید تین چار ماہ ہی پڑھایا ہو، ایک ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ یا ایک کاپی سے مولانا لکچر دیتے تھے جو ہم لکھ لیتے تھے، حضرت مولانا مجھ پر خصوصی عنایت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے ایک بڑی حکیمانہ بات کہی کہ ''رضوان صاحب! آدمی دوسری زبان جب سیکھتا ہے جب اپنی زبان بھول جائے'' یہ بات میں نے اپنی گرہ میں باندھ لی اور قیام حجاز و مصر کے دوران میں میں نے بیشتر بلکہ تمام تر ربط وضبط عرب طلبہ اور احباب سے رکھا، اور حقیقت یہ ہے کہ جب تقریباً پانچ سال بعد میں پہلی بار ہندوستان واپس آیا تو میری زبان پر اکثر عربی کے الفاظ آجاتے تھے، یہاں تک کہ کراچی میں جہاں میں ڈیڑھ دو ماہ راستے میں رکا تھا ایک دوست ظفر اسحاق انصاری نے کہا کہ ''رضوان صاحب تو اُردو گفتگو میں بہت سے عربی کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں''۔

مولانا کی علمی توجیہات میں یہ بھی تھا کہ میں **ابن الأثیر کی الکامل فی التاریخ، اور کتب التراجم ابن خلکان کی وفیات الأعیان، شوکانی کی البدر الطالع لمن بعد للقرن السابع اور عبدالقادر العیدروس الحضرمی کی النور السافر فی اعیان القرن العاشر، المجمی کی سلك الدر فی اعیان القرن الحادی عشر اور نجم الدین الغزنی کی الکواکب السائرة فی اعیان المئة الثانیة عشرة** پڑھوں، یہ کتابیں اس وقت تو میرے معیار علمی اور حوصلہ سے بلند تھیں، لیکن بعد میں اپنی تدریسی اور علمی و تحقیقی زندگی میں میں نے ان

سے بہت فائدہ اٹھایا۔

مجھے یاد ہے کہ حضرت مولانا نے ان ہی دنوں مجھے اپنی ایک ذاتی کتاب **رنات المثالث والمثانی** پڑھنے کو دی تھی جو ابوالفرج الاصفہانی کی ضخیم کتاب الاغانی کی تلخیص کی ایک جلد تھی، بیروت کی چھپی ہوئی کتاب کی جلد پر مولانا مرحوم نے بہت سلیقہ سے ایک سفید موٹا کاغذ چڑھایا ہوا تھا۔

ادارۂ تعلیمات اسلام میں عربی زبان کی تعلیم اور اس کے نتیجہ میں جلد ہی اتنی استعداد کہ مجھے ندوہ کے درجہ عالمیت میں داخلہ مل گیا، اس پر مولانا محمد منظور نعمانی صاحب بہت متعجب تھے جس کا اظہار انھوں نے مولانا مرحوم سے کیا تھا اور خود مولانا نے مجھے بعد میں بتایا۔

ادارۂ تعلیمات اسلام کی یادوں میں سے یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اُن دنوں اکثر بعد عصر میں حضرت مولانا مرحوم سے ملنے مولانا کی قیام گاہ گوئن روڈ، محمد علی لین کی مسجد جایا کرتا تھا جہاں مولانا مسجد کے صحن میں اس کے صفہ (چبوترے) پر پاؤں نیچے لٹکائے بیٹھتے تھے اور بعض ملاقاتی وہاں آ کر ملتے تھے، ان ہی ملاقاتیوں میں سے ایک بہت اہم شخصیت مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی ایک مرتبہ تشریف لائے، جو حضرت مولانا مرحوم کے پیر بھائی اور عمر میں بہت بڑے تھے، اس موقعہ پر جو گفتگو ہوئی وہ مجھے آج تک یاد ہے، اور ہندوستان کی اسلامی سیاست میں مولانا مرحوم کے مزاج و فکر کی ترجمان تھی جو مجلس احرار اور جمعیۃ العلماء ہند سے بالکل مختلف تھی۔

مولانا حبیب الرحمان صاحب نے ہمارے مولانا سے کہا کہ آپ اخبارات کو یہ بیان دیں اور اپنی تقریروں میں کہیں کہ مسلمان اس وقت اپنے آپ کو اس صورت حال میں سمجھیں جیسے ہجرت مدینہ سے قبل مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کی تھی۔ مولانا نے جواب دیا ''معاف فرمائیے، میں یہ مناسب نہیں سمجھتا اور ایسا کوئی بیان نہیں دے سکتا ہوں، میں مسلمانوں کو گوسفندی کا درس نہیں دے سکتا ہوں'' (مفہوم یہی تھا، الفاظ کچھ مختلف رہے ہوں گے)۔ اپنے جواں عمر مولانا کی قدر اس جواب سے ان سفید ریش سیاسی عالم کے مقابلے میں میرے نزدیک بہت بڑھ گئی۔

ان ہی ایام (ادارۂ تعلیمات اسلام کے تین ماہ) میں مولانا مرحوم کے رفیق درس و تدریس مولانا محمد ناظم صاحب ندوی مستقل طور پر پاکستان جانے والے تھے، ایک شام بعد مغرب مولانا مرحوم نے ان کو گوئن روڈ کے اولین حصہ میں ایک چائے خانے میں مدعو کیا، استاذ محترم مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی بھی تھے، یہ ناچیز طالب علم بھی ساتھ تھا، اور وہاں چائے کے ساتھ میں نے پہلی مرتبہ گرم گرم شامی کباب کھائے (غالباً سموسے بھی تھے) اب تک رامپور میں چائے کے ساتھ کیک، پیسٹری، بسکٹ ہی کھائے تھے۔ انہی ایام میں مولانا مرحوم نے مجھے اپنی کتاب ''مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت'' دی اور پھر مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا جو تقسیم ہند سے پہلے چھپ گئی تھیں (مولوی طارق زبیر ندوی کی کتاب جو مولانا مرحوم کی اُردو تصانیف سے متعلق ہے اس میں ان دونوں کتابوں کے ان ادارۂ تعلیمات اسلام کا کورس پورا کرنے کے بعد میں گھر رام پور گیا ہوا تھا تو رمضان میں مولانا مرحوم نے لکھنؤ سے مجھے لکھا میں دہلی پہنچوں جہاں مولانا تشریف لئے جارہے ہیں اور محلہ قصاب پورہ پہاڑ گنج کی مسجد میں مقیم ہوں گے، وہاں حضرت عبدالقادر رائے پوری تشریف فرما ہیں، میں پہنچا، اور مولانا مرحوم نے مجھے حضرت رائے پوری سے بیعت کروادیا، یہ ۱۳۶۸ھ (۱۹۴۸ء) کا رمضان تھا، مسجد میں نئے اور پرانے مریدین اور ذاکرین وشاغلین کا ہجوم تھا، ایک جانبی حجرے میں حضرت رائے پوری کا قیام تھا، ہم لوگ اندرون مسجد سوتے تھے، اور اکثر ذاکرین دوپہر کے گیارہ بارہ بجے تک سوتے رہتے تھے، میرے لئے یہ منظر نیا تھا کہ رام پور میں اپنے گھر فجر کے بعد گھنٹہ دو گھنٹہ سو جاتے تھے، پھر کام۔ یہیں قصاب پورہ پہاڑ گنج کی اس مسجد میں میں نے ایک اچھے خاصے فربہ جوان باریش کو دیکھا کہ وہ دن میں مسجد میں سو رہے ہیں اور ایک تکیہ پیروں کے بیچ میں ہے، یہ منظر مجھے بہت ہی عجیب اور نامانوس لگا۔

تین چار روز اس مسجد میں قیام کے بعد میں نے اجازت چاہی اور رام پور واپس ہو گیا حضرت مولانا بھی جو بیشتر رمضان تکیہ رائے بریلی میں گزارتے تھے واپس ہوگئے، غالباً دو ایک روز بعد رام پور سے میں نے مولانا مرحوم کو ایک کارڈ لکھا (زیادہ تر دو طرفہ مراسلت ان دنوں ہندوستان میں پوسٹ کارڈس پر ہوتی تھی، جو اب تک میرے پاس محفوظ ہیں) بیعت کرانے کا شکریہ ادا کیا اور اپنی سعادت وخوش بختی کا اظہار۔ لیکن ساتھ ہی بعض ان مناظر کی بنا پر جو مسجد قصاب پورہ میں میں نے دیکھے (دن بھر سوتے رہنا وغیرہ) ان کی بنا پر ایک گستاخانہ شعر بھی لکھدیا۔

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی
(اقبال)

مولانا کی عالی ظرفی اور خورد نوازی کہ انہوں نے اسے میری گستاخی پر محمول نہیں کیا اور کوئی بھی اظہار ناراضگی نہیں کیا۔ اس کو یاد

کر کے میں ہمیشہ مولانا مرحوم کے اخلاق عالیہ کا دل سے اعتراف کرتا رہا۔ اس وقت تک مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ خود مولانا مرحوم اقبالؔ کے کیسے عاشق اور ان کے کلام کے شناور تھے۔ شاید خود مولانا مرحوم کو اس قسم کا انداز خانقاہی پسند نہ ہو۔

یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ۱۹۹۶ء کے رمضان میں اولین ایک ہفتہ مجھے تکیہ رائے بریلی میں گزارنے کا موقعہ ملا، اگر چہ میں دوسرے مہمانوں کیساتھ مولانا کی قیام گاہ کے اوپر مہمان خانے میں مقیم تھا، اور سو کے قریب معتقدین وطلبہ وغیرہ مدرسۂ سید احمد شہید حفظ قرآن میں مقیم تھے، ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ مسجد میں بھی سوتے ہوں، لیکن سب لوگ دس بجے کے قریب بیدار ہوجاتے تھے اور گیارہ بجے کے قریب صحن مسجد میں درسِ قرآن وحدیث میں شریک ہوتے تھے۔

ندوہ میں اسی سال ۱۳۶۸ھ (۱۹۴۸ء۔۱۹۴۹ء) میں کچھ ماہ بعد مظاہر العلوم کے فارغ التحصیل مولوی محمد طاہر صاحب (بعد میں ندوہ کے ناظم مال یا خزانچی) بھی عربی ادب کے مطالعہ کیلئے آگئے تھے۔

میں ندوہ سے فارغ ہوکر (عالمیت کے بعد) رام پور چلا گیا تھا۔ حضرت مولانا مرحوم نے طے کیا کہ ندوہ کے کچھ طلبہ واساتذہ کو مکہ مکرمہ ایک سال کے لئے بھیجا جائے تاکہ وہاں وہ اپنی عربی زبان درست کریں اور تقریر اور گفتگو کی مشق بہم پہنچائیں، ان میں مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا محمد رابع صاحب ندوی اور مولوی محمد طاہر صاحب کے ساتھ یہ خاکسار بھی شامل تھا۔ ہم لوگ حج بدل پر گئے تھے (مولانا عبداللہ عباس صاحب کا معلوم نہیں، کیونکہ وہ دوسرے حج سے قبل واپس آگئے تھے) اس لئے ایک سال ٹھہرنا تو سب کے لئے ضروری تھا کہ آئندہ سال اپنا حج کریں، یہ بڑا مبارک سفر حج تھا کہ اس میں ہمارے شیخ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری اور حضرت مولانا مرحوم کے ہم لوگ رفیق وسفر حج تھے۔

مجھے سفر حج کی بات اقبالؔ کے ایک شعر کی مناسبت سے یاد آئی تھی، مکہ مکرمہ پہنچ کر جب حضرت رائے پوری قدیم باب السلام سے ملحق ایک عمارت میں رباط داؤدی میں قیام فرما تھے، اوپر کی منزل میں اور وہیں نماز حرم میں اقتدا ہوتی تھی غالباً مولانا مرحوم بھی حضرت کے ساتھ مقیم تھے یا ایک شب وہاں آئے ہوئے تھے نماز عشاء اور کھانے کے بعد ایک بڑے کمرے میں مولانا مرحوم قدرے بے چینی سے ٹہل رہے تھے، میں بھی نظام شمسی کے ایک سیارے کی طرح ساتھ گردش میں تھا، مولانا مرحوم کسی بات سے بہت ملول یا متاثر تھے، اچانک فرمانے لگے ''رضوان صاحب! یہ مدارس تو نوجوانوں سے کچھ صلاحیتیں سلب کرلیتے ہیں اور پھر اقبال کا یہ شعر پڑھا ؎

خبر نہیں کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ صوفی وشاعر کی ناخوش اندیشی

چونکہ یہ خاکسار بنیادی طور پر کسی عربی مدرسے کا طالب علم نہ تھا، اس لئے حضرت مولانا مرحوم مجھ سے بعض وہ باتیں کہہ دیتے تھے جو شاید دارالعلوم ندوہ کے اپنے طلبہ سے بھی نہ کہتے ہوں۔ مولانا مرحوم کے ساتھ حضرت رائے پوریؒ کے واپس جانے کے بعد رباط بھوپال میں قیام تھا، مولانا اوپر ایک کمرے میں تھے ہم چاروں یا تین طالب علم نیچے کی منزل میں ایک کمرے میں تھے، مولانا اس زمانے میں بڑے شوق وجذبے کے ساتھ اقبالؔ کے مختلف اشعار سناتے تھے، خاص طور سے وہ جو رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے متعلق ہیں، جیسے ''وہ دانائے سبل ختم الرسل، مولائے کل جس نے + غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا..... یارو زیبا تیغ او آہن گداز + دیدۂ او اشکبار اندر نماز۔

اس سے قبل کہ میں بعد کے زمانے کی یادوں کا ذکر کروں، ندوہ کے زمانے ہی میں فتح پور ہنسوہ کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے، حضرت مولانا مرحوم کے خاندان کے کچھ لوگ فتح پور ہنسوہ (یوپی) میں رہتے تھے، حضرت مولانا اپنی اہلیہ کے ساتھ وہاں جارہے تھے، مجھے بھی رفاقت کے لئے اختیار کیا، فتح پور میں وسیع مردانہ مہمان خانہ کے ایک دالان میں ہم دونوں کی چارپائیاں تھیں مولانا کو اس روز شدید بخار ہوگیا تھا۔ جلد ہی عشاء کے بعد آرام کے لئے لیٹ گئے، میزبان نوجوان نے ایک گرم دودھ کا گلاس ساتھ ہی ایک اسٹول پر رکھ دیا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد میں یہ مولانا کو پلادوں، میں لیٹا اور فوراً میری آنکھ لگ گئی، اچانک کہیں سے بلّی آئی اور اس نے دودھ پر حملہ آور ہوکر گلاس گرادیا، اب مولانا نے جو سر پر چادر اوڑھے لیٹے تھے کہ پسینہ آکر بخار اتر جائے، مجھے آواز دی کہ وہ دودھ تو گیا، میں گھبرا کر اٹھا اور بہت شرمندہ ہوا، معذرت کی، مگر فرشتوں کے خاندان والے شخص نے مجھ سے کسی ناراضگی کا اظہار نہ کیا اور 'کوئی بات نہیں' کہہ کر خاموش ہوگئے۔

مکہ مکرمہ کے اس زمانہ قیام میں مجھ سے ایک غلطی ہوگئی تھی کہ ایک سعودی خاندان کے امیر عبداللہ الکبیر کے یہاں دوپہر کی ایک دعوت کے بعد جب ہم رخصت ہوئے تو میں سب سے بعد میں کمرہ سے باہر نکلا، اور امیر موصوف نے ریالات (اس زمانے میں کرنسی نوٹ نہ تھے، چاندی کے بھاری ریال یا سونے کی اشرفیاں تھیں) کی ایک تھیلی (غالباً دوسو ریال، جو آج کل دس ہزار روپئے کے برابر ہیں) میرے

ہاتھ میں دی کہ میں شیخ (مولانا) کو دیدوں، باہر آکر جب میں نے وہ تھیلی مولانا کو دی تو اظہار تاسف کیا، اس میں سے صرف دس ریال رکھ لئے اور باقی مولوی عبدالرشید ندوی (جو ہم سے قبل ایک سال وہاں معین اللہ صاحب ندوی کے ساتھ مقیم تھے اور مولانا مرحوم کے نمائندے تھے) کے ہاتھ امیر عبداللہ الکبیر کو بھجوادیئے کہ ہم نے اپنی ضرورت کی رقم اس میں سے لے لی ہے (یہ اس لئے ضروری تھا کہ پورے ہدیہ کو لوٹانا وہاں بڑی گستاخی شمار ہوتی تھی)۔

مکہ مکرمہ اور بعد کو قیام مصر کے زمانہ میں تقریباً پانچ سال تک حضرت مولانا سے مسلسل مراسلت رہی، اور پھر بعد کو مختلف ممالک میں (یہ خطوط میری متاع عزیز ہے اور محفوظ ہیں) مارچ ۱۹۵۵ء میں ہندوستان واپسی پر جب میں کچہری روڈ کے مرکز تبلیغ میں آکر مولاناؒ سے ملا تو گرمجوشی اور شفقت کے ساتھ معانقے کے بعد فرمایا، الحمدللہ کہ آپ اُردو زبان بھولے نہیں ہیں، اور یہ بھی فرمایا، خیال تھا کہ آپ ''بسطةً فی العلم والجسم'' کے ساتھ واپس آئیں گے، لیکن شاید نیل کے پانی کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا، (عام طور پر مصر کے لوگ فربہ اور جسیم ہوتے ہیں، میرا وزن وہاں نہیں بڑھا تھا)۔

ایک دلچسپ بات اس زمانہ کی یاد آرہی ہے ۱۹۵۵ء کو رمضان میں مولاناؒ نے مجھے رام پور لکھا کہ رمضان تکیہ (رائے بریلی) میں گزاروں اور تراویح میں قرآن سناؤں، میں نے تعمیل حکم کی، موجودہ دومنزلہ مہمان خانے (بنگلے) کا صرف نیچے کا نامکمل حصہ اس وقت تعمیر شدہ تھا، شاید ایک کمرہ تھا جس میں دروازہ بھی نہ تھا، بجلی بھی نہ تھی، رات کو میرے پاس ایک لالٹین رکھ دی جاتی تھی، اکیلا سوتا تھا، اور وہیں سحور آجاتا تھا۔

قاہرہ (مصر) کے زمانہ قیام میں ۱۹۵۴ء میں میری ملاقات اتفاقاً وہاں مرحوم ڈاکٹر نظام الدین صاحب، ڈائرکٹر دائرۃ المعارف العثمانی حیدرآباد، دکن سے ہوگئی تھی جو مرلسٹن یونیورسٹی میں ایک اسلامی کانفرنس سے واپس ہندوستان جاتے ہوئے قاہرہ میں رکے تھے، اور ان ہی کے ذریعہ ازہر یونیورسٹی کے پروفیسر (فلسفۂ اسلامی) ڈاکٹر محمد اُلمی سے ہوئی (بعد کو ۱۹۶۳ء جب میں کیمبرج سے ڈاکٹریٹ کے بعد قاہرہ آیا تو یہ وزیر اوقاف تھے، محبت سے ملے تھے اور مجھے سرکاری مہمان بنالیا تھا) ڈاکٹر نظام الدین صاحب کی ترجمانی میں نے مرحوم ڈاکٹر احمد امین سے ان کی ملاقات میں کی، اور دو روز ان کی رفاقت میں رہا، میں جب تکیہ رائے بریلی میں رمضان میں مولانا کے پاس مقیم تھا تو ان کا ایک خط میرے پاس آیا جس میں مجھے دائرۃ المعارف العثمانیہ میں عربی مترجم یا ریسرچ اسسٹنٹ کی ملازمت پیش کی تھی، اور سو روپے ماہوار تنخواہ کی پیش کش کی تھی، میں جب ۱۹۴۶ء میں رام پور کے حامد ہائی اسکول میں ٹیچر تھا تو اُس وقت بھی میری تنخواہ سو روپے ماہانہ تھی، اب تو میں حجاز مقدس ومصر کے سفر سے اچھا خاصہ ''علم کا وزن'' لے کر آیا تھا مجھے ان کی پیش کردہ تنخواہ بڑی حقیر لگی، میں نے جواباً ایک پوسٹ کارڈ لکھا، معذرت کرتے ہوئے یہ لکھ دیا ''ہم نے مانا گو ہیں دلّی میں پر کھائیں گے کیا'' حضرت مولانا کو دکھایا، بہت خوش ہوئے کہا ''آپ نے بہت ٹھیک لکھا ہے''۔

چونکہ میں اپنے طویل سفر میں کوئی علمی ڈگری لے کر نہ آیا تھا، اس لئے مجھے مناسب ملازمت میں مشکل ہورہی تھی، رام پور کے کرنل بشیر حسین زیدی جو اس وقت ایم پی اور دہلی میں ایک اہم شخصیت تھے میرے والد کے دوست تھے، علی گڑھ میں کسی ملازمت کے لئے ان سے کہا تو انھوں نے کہا کہ آپ مصر سے کوئی ڈگری تو لے کر آئے نہیں، بغیر ڈگری کے صرف عربی دانی سے ملازمت ملنا ممکن نہیں مولانا کو میری اس پریشانی کا علم تھا، ندوہ میں تو شاید اس زمانے میں سو روپے ماہوار بھی کسی کی تنخواہ نہ تھی، اتفاقاً دمشق کے کلیۃ الشریعہ کی طرف سے مولانا مرحوم کو تین طلبہ کے لئے وظائف پیش ہوئے، چار سال کا کورس تھا، مولانا نے مجھ سے دریافت کیا، میں تیار ہوگیا، دوسرے دو ساتھی مولوی محمد راشد ندوی اور مولوی اجتباء ندوی (یہ دونوں ماشاء اللہ سے اب پروفیسر ڈاکٹر کے لقب سے جانے جاتے ہیں) تھے، موخر الذکر بعد میں دمشق آئے۔

چھ سات ماہ بعد خود حضرت مولانا وزیٹنگ پروفیسر (دو ماہ) کی حیثیت سے دمشق تشریف لائے، اور شیخ عبدالوہاب اصلاحی (مرحوم حافظ محمود صاحب پیشاوری مکی خسر) کے یہاں حلبونی میں قیام کیا، یہاں رمضان آگیا، رمضان میں تراویح میں میں اور حافظ محمود صاحب جو اس زمانہ میں دمشق میں تھے عبدالوہاب اصلاحی صاحب مرحوم کے یہاں قرآن سناتے تھے، آدھا آدھا قرآن ہم دونوں نے سنایا تھا۔

دمشق سے مولانا مرحوم کی واپسی کے بعد بہت زیادہ اور مسلسل مراسلت رہی، اس زمانے میں مجھے بڑے ہی شفقت آمیز خطوط تحریر فرماتے تھے، مولانا مرحوم کے بعد کے اور موجودہ دسیوں بیسیوں ندوی معاونین سے قبل دمشق کے زمانہ قیام میں اس خاکسار وناچیز خادم نے سب سے پہلے حضرت مولانا کے والد مولانا حکیم عبدالحیٔ صاحب کی کتاب معارف العوارف (مطبوعہ ایڈیشن کا نام **الثقافة الاسلامية**

فی الهند) المجمع الاثری العلمی (حال مجمع اللغۃ دمشق) سے چھپوائی، یعنی اکاڈمی کے پریسیڈنٹ خلیل مردم بک پر اس کی طباعت کے لئے تقاضے کرتا رہا، پھر اصل کو پڑھا اور پروف ریڈنگ کی بعد میں روائع اقبال، دارالفکر دمشق سے چھپوائی (افسوس کہ مولوی عبدالماجد غوری نے اپنی تازہ کتاب **ابوالحسن علی الحسنی الندوی، الإمام المفكر الداعية الأديب** (دارابن کثیر، دمشق) میں کتاب کے اس اولیں ایڈیشن کا ذکر نہیں کیا ہے، جو ۱۹۶۰ء میں چھپا تھا۔ ساتھ مولانا کے وہ لکچرس جو مولانا کلیۃ الشریعۃ کو دے آئے تھے کہ وہ کتابی شکل میں دمشق یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوں، اس کا تتبع و تقاضا بھی میں مرحوم استاذ معظم الأستاذ محمد المبارک سے کرتا رہا بالآخر وہ میرے زمانہ قیام ہی میں طبع ہوئی۔)

قیام دمشق کے زمانے میں میں نے حضرت مولانا کی بہت دعائیں لی ہیں، جو بعد کی زندگی میں میرے کام آئیں اور کیمبرج میں میری اعلیٰ تعلیم کے لئے غیب سے دمشق میں اور بعد میں لندن میں سامان مہیا ہوگیا مرحوم مولانا ہی کے واسطے سے مجھے دمشق کے مشہور بزرگ، شیخ اکبر ابن عربی کے علم کے حامل صوفی بزرگ شیخ احمد ہارون الحجار العسل سے تعلق ہوا تھا، کلیۃ الشریعۃ سے فراغت کے بعد جب میں اپنی کتاب "العز بن عبدالسلام" کی دارالفکر میں طباعت اور کیمبرج میں داخلے کی خط وکتابت میں مشغول تھا اور داخلے کی منظوری کے بعد کوئی مالی سہارا نہ ہونے کے سبب بہت پریشان رہتا تھا تو میں نے ان بے ریش، نمدے کی ٹوپی اوڑھنے والے ایک موٹا جھوٹا معمولی کپڑے کا لانبا قمیص پہننے والے بزرگ کے پاس جانا شروع کردیا، میرے استاذ ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی بھی ان کے بہت معتقد تھے، میں بھی شیخ کی فرمائش پر شیخ ابن عربی کی قلمی کتابوں سے پڑھ کر ان کو کچھ سناتا تھا ان کی صحبت میں مجھے بڑا سکون قلب حاصل ہوتا تھا شام کو اس فقیر بے نوا اور زاہد بے ریا کے پاس معتقدین کا ہجوم ہوتا تھا اور مغرب کی باجماعت نماز ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد ہارون ہی کے ذریعہ میری دستگیری کی۔ اس طرح میرے لندن کے کرایہ اور وہاں چند ماہ قیام کا انتظام ہوگیا تھا، مولانا مرحوم میرے اس عزم سے مطلع اور میری ہمت افزائی اور تسلی فرماتے تھے، پھر مولانا مرحوم کی دعاؤں ہی کا اثر تھا کہ غیب سے لندن میں میرے ایک مصری اخوانی دوست عزالدین ابراہیم (حال ایڈوائزر شیخ زاید آل نہیان) نے کیمبرج یونیورسٹی کے حسب طلب سال بھر کے مصارف کی ایک بڑی رقم میرے نام سے بنک میں جمع کردی، میں نے اس رقم میں سے ایک پائی استعمال نہ کی اور دوسرے ذرائع مہیا ہوتے رہے جن میں کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی پڑھانے کی میری ایک سال ملازمت اور مڈل ایسٹ سینٹر میں ایک سال ریسرچ اسسٹنٹ کی ملازمت شامل تھی، جو میرے شفیق اور قدرداں پروفیسر آربری کی عنایت تھی۔

مولانا مرحوم سے کیمبرج سے بھی برابر مراسلت رہی، وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے میری ڈھارس بندھاتے رہے، اور کبھی کبھار کسی ذریعہ سے میرے لئے کچھ مالی انتظامات کراتے رہے، میں ہمیشہ اس کا اعتراف کرتا رہا اور آج بھی اپنے ممدوح ومخدوم کی وفات کے بعد اس کا سب کے سامنے علی الاعلان اعتراف کرتا ہوں مولانا مرحوم دوری کے باوجود اپنے خطوں میں مجھ پر اپنی شفقت بے پایاں فرماتے تھے، مولانا مرحوم کے کلمات دعا میرے لئے سرمایۂ نجات ہیں مولانا کے مرض فالج کے بعد کراچی سے ایک روز ٹیلی فون پر میں مولانا مرحوم کے خادم خاص سے خیریت پوچھ رہا تھا، مولانا نے خود ٹیلی فون لے لیا، میں نے خیریت پوچھی، اور یہ کہنا چاہتا تھا بلکہ الفاظ زبان پر تھے کہ آپ کا غلام آپ کے لئے دعا کررہا ہے اور خیریت پوچھتا ہے، فرمایا "نہیں آپ تو ہمارے محب ہیں" آج بھی میری آنکھیں یہ یاد کرکے نم ہیں۔ اس کا شدید افسوس رہا کہ میں فالج کے بعد حاضر نہیں ہوسکا، کچھ گھریلو حالات اور کچھ دوسرے اسباب، پھر خود مولانا کے خطوط اور دوسرے ذرائع سے خبریں مل رہی تھیں کہ مرض میں کافی افاقہ ہے، بس کمزوری بہت ہے جس کا حضرت مولانا خطوں میں بھی ذکر فرماتے تھے خیال تھا کہ پوری طرح صحت بحال ہوجائے، ویزے کی سہولت ہوجائے تو جاؤں تاکہ کچھ زیادہ وقت رہ کر علمی استفادہ بھی کروں لیکن "**وكان امر الله قدراً مقدوراً**"

یادوں کے ضمن میں ایک اہم بات یہ بھی یاد آرہی ہے کہ کیمبرج سے ڈاکٹریٹ کے فوراً بعد جب ریاض کی کنگ سعود یونیورسٹی میں مجھے ملازمت مل گئی تھی اور دوسرے ۱۹۶۴ء۔ ۱۹۶۵ کے تعلیمی سال میں میں مکہ مکرمہ کے کلیۃ الشریعۃ میں پڑھا رہا تھا تو حضرت مولانا اور مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رابطہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے میں ریاض میں ایک سال کی ملازمت کے بعد کچھ پس انداز کرکے موسم گرما کی تعطیلات میں لندن سے اپنے لئے ایک کار لایا تھا، مولانا مرحوم، برادر محترم مولانا عبداللہ عباس صاحب کے فلیٹ میں حرم شریف سے قریب ہی ٹھہرے ہوئے تھے، میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔ مولانا مرحوم کو رابطہ کی طرف سے آمد ورفت کے

لئے ایک کار ملی ہوئی تھی، مولانا عبداللہ صاحب بھی ان دنوں رابطہ سے متعلق تھے، میں نے مولانا سے عرض کیا کہ میں آپ کا ڈرائیور بننے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں اور آپ کو اپنی کار میں رابطہ کے آفس میں چھوڑ آؤں گا مولانا نے قبول فرمایا، گاڑی میں مولانا آگے بیٹھے اور مولانا محمد منظور نعمانی صاحب پیچھے، وہ بھی اچھی خاصی بڑی برٹش کار تھی، اگرچہ رابطہ کی بڑی امریکن گاڑی کے برابر نہیں، مولانا نے کار میں تشریف رکھتے ہی عربی میں مجھے مبارکباد دی یہ کہتے ہوئے **بارك الله لك فيها إنها طيبة مريحة** "ڈرائیونگ میں نے کیمبرج میں آخری زمانے میں سیکھ لی تھی۔

پھر مکہ سے بنغازی (لیبیا) یونیورسٹی جانے کے بعد اپنی بدنصیبی سے میں نے کچھ عرصہ کتنے ہی طویل وقت مولانا کو خط نہیں لکھا اور پھر ایک بار معذرت کا خط ندامت کے ساتھ لکھا اور فارسی کا یہ شعر بھی:

غلام ہمت آں مرد باصفا ہستم
"کہ یک صواب پند وصد خطا پوشد

مولانا مرحوم کا شفقت بھرا خط آیا جس میں مولانا نے تحریر فرمایا تھا۔ ع

از ما بجز حکایت مہر ووفا مپرس۔

مکہ مکرمہ میں جب تھا اُس وقت بھی مولانا مرحوم نے میری کھانے کی دعوت قبول فرمائی، اور میں نے اپنے ایک دوست کے باورچی کو بلا کر کھانا پکوایا، مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مرحوم بھی تشریف لائے تھے اور شاید مولانا عبداللہ صاحب بھی پھر جب کافی عرصہ بعد دوبارہ لیبیا سے ریاض جامعۃ الامام میں آیا اور ۱۹۸۵ء کے اوائل میں مولانا ڈاکٹر عبداللہ ترکی کی دعوت پر ریاض دو روز کے لئے تشریف لائے مولوی جعفر مسعود میاں کے ساتھ، تب بھی اس پرانے خادم کی دعوت قبول کی تھی، اس موقعہ پر مولانا مرحوم نے خوش مذاقی میں مجھے اپنے کچھ شعر بھی مشہور بحر و قافیہ میں سنائے تھے، افسوس کہ میں نے اس وقت وہ تین چار شعر لکھ نہیں لئے، لیکن ایک شعر کا ایک مصرعہ اخیر یاد ہے۔ ع "ہم کو مرغ وکباب نے مارا" کچھ دوسرے قریبی لوگوں کو غالباً معلوم ہو کہ حضرت مولانا شعر بھی کہتے تھے، یہ کچھ بعید نہیں کیونکہ خاندان میں شعر وادب کا چرچا رہا، والد مشہور ادیب ونقاد، والدہ شاعرہ، ایک بہن شاعرہ، ایک بھانجے شاعر، کچھ بعید نہیں کہ مولانا مرحوم بھی کسی وقت شعر کہتے ہوں۔ یونیورسٹی کی کار کے بجائے حضرت مولانا رات کو بارہ بجے میری گاڑی میں ایرپورٹ تشریف لے گئے اور دیر تک باہر لاؤنج میں بیٹھے رہے۔ مولانا مرحوم کا آخری خط شعبان میں آیا تھا جس میں خوش خبری دی تھی کہ کاروانِ زندگی کی آخری ساتویں جلد پریس سے آگئی ہے، آپ پڑھیں، وہ حضرت مولاناؒ کی وفات سے قبل یہاں نہ آسکی۔

نومبر ۱۹۹۷ء میں مولانا مرحوم سے آخری ملاقات ہوئی رابطۂ ادب عربی کے اجلاس میں لاہور تشریف لائے تھے، میں لاہور ملنے گیا تھا اور خیال تھا کہ اپنے ساتھ کراچی لاؤں گا، میرے گھر میں بھی نور کی بارش ہوگی لیکن ویزہ صرف پانچ روز کا تھا، مولانا نے توسیع کرانا بھی پسند نہیں کیا، آئندہ ماہ شاید بنگلور کا سفر درپیش تھا یا کوئی اور مشغولیت تھی، ایرپورٹ پر مجھے دیکھ کر مسرت کا اظہار فرمایا تھا اور یہ کہ ہمیں یقین تھا کہ آپ لاہور آئیں گے" وہاں ایک شب میں نے مولانا فضل الرحیم صاحب (جامعہ اشرفیہ) کے مکان پر گزاری۔ تاکہ قرب حاصل ہوسکے، فجر برادرم مولانا رابع صاحب نے کمرے ہی میں جماعت کے ساتھ پڑھائی چند لوگ شریک جماعت تھے، پھر آرام کے بعد ناشتے پر بھائی عثمان صاحب انجینئر کے ذریعہ یاد فرمایا اپنے پہلو میں جگہ دی، چند ہی لوگ اور ناشتہ پر آئے کمرۂ خواب میں تھے، میری درخواست پر مرحوم نے میرے دو دوستوں کو بیعت فرمایا جو خاص اس مقصد کے لئے گئے تھے۔

میرے احساس رنج واندوہ سے متاثر ہوکر رام پور ہائی اسکول کے پرانے شاگرد نے حضرت مولانا پر تعزیتی نظم میں حقیقت بیان کردی ہے۔

عالم میں انتخاب تھے سید ابوالحسن
تھے جس کا انتخاب وہ اب اُس کے گھر گئے

اور مولانا مرحوم کے محبوب ترین شاعر اقبال کی زبان میں:

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

میرا اپنا ذاتی احساس یہ رہا کہ حضرت مولانا کو القاء ہوگیا تھا کہ اب آخری وقت آنے والا ہے، جبھی وہ ۲۰ رمضان کو باصرار ڈاکٹروں کی ممانعت کے باوجود اپنے بزرگوں کی نورانی بستی تکیہ چلے گئے، اور عمر بھر کا تھکا مسافر، دردمند و جاں گداز مبلغ، اسلام اور امت کی فکر میں ہر وقت بے چین رہنے والا، اپنے دماغ کو ہر لحظہ بیدار اور قلم کو متحرک رکھنے والا نقرس کے مرض میں بھی وہیل چیئر پر نگری نگری دیس بدیس اللہ کا پیغام پہنچانے والا انتہائی تھکا ماندہ پُرعزیمت مسافر موت آنے پر چین کی نیند سویا۔ ع موت آگئی کہ "شیخ کو آرام مل گیا" سب کی دعا ہے آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔ اللهم اكرم مثواه عندك و طيب ثراه، اللهم نور مرقده وارفع درجاته وارض عنه۔

❀❀❀❀❀

صہیونیت

شمعدان کا قصہ کیا ہے؟

تیسرے ہیکل کی تعمیر کب اور کیسے؟

مولانا سید سلمان الحسینی

شمعدان کا کیا قصہ ہے!؟

یہاں سات گوشہ "مقدس" شمعدان کے سلسلہ میں بھی طرح طرح کی باتیں ہورہی ہیں، وہ یہودیوں کے نزدیک بڑی دینی نشانی ہے۔ جو تخلیق کائنات کے ان سات دنوں کی نمائندگی کرتی ہے جن کا ذکر تورات میں ہے، اور یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ ساتویں دن کی تاجپوشی کریں گے، اسی لئے انہوں نے اسکو اسرائیلی حکومت کا سرکاری نشان بنادیا ہے، اسرائیلی حکومت کے سکوں پر وہ نقش ہے کاغذ کے نوٹوں پر چھپا ہوا ہے، محفلوں اور کلیساؤں کے اسٹیجوں پر وہ نمایاں طور پر دکھایا جاتا ہے یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ "قدس الاقداس" تقدس ہیکل میں اسی وقت مکمل ہوگا جب کہ اس کو اس میں روشن کیا جائے گا۔ آج وہ اس مذہبی تاریخی اور سیاسی نشانی کو ایک حقیقت اور واقعہ بنانا چاہتے ہیں۔

سات پہلوؤں والا شمعدان صرف ایک نہیں ہوگا۔ اس وقت قدیم "شمعدان" کی تلاش کی کوششیں جاری ہیں، اور نئے "شمعدان" بھی تیار کئے جارہے ہیں۔

"ہیکل کے بانی"، تنظیم کے لیڈر "باروخ بن یوسف" نے اگست ۱۹۹۷ء میں فرانسیسی نیوز ایجنسی کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا۔

"ان کی تنظیم نے ایک زبردست سونے کی شمعدان امریکا میں تیار کرلیا ہے اور اسے اسرائیل منتقل بھی کردیا گیا ہے انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کی تنظیم نے دیگر تنظیموں کے ساتھ مل کر ان "حاخاموں" مذہبی ذمہ داروں کو تیار کرنا شروع کردیا ہے، جو ہیکل میں انجام دیئے جانے والے مذہبی شعائر کو بہتر طریقہ پر ادا کرسکیں۔

مصر کا ایک یہودی ملنیر جس کا نام "موسیٰ فرخ" ہے اس نے اپنے دوست بنیامین --- سابق وزیر اعظم۔ کی دعاؤں کے ساتھ۔ وزیر اعظم بننے سے پہلے امریکا میں دوسرے سونے کے شمعدان کی تیاری کا کام شروع کیا تھا، جہاں وہ الماس کی تجارت کرتا تھا۔ قدس کے امیر "ایہود الرت" کا بیان ہے کہ وہ شمعدان بنا کر تیار کرچکا اور "خیمہ اجتماع عہد وپیمان" بھی تیار کرچکا ہے، جس کے بارے میں یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ "ہیکل" میں اسے بھی رکھنا ضروری ہے، کیونکہ وہ اس خیمہ کا رمز ہے، جس میں حضرت موسیٰ کی فرشتوں سے ملاقات ہوئی تھی، اور فرشتوں نے یہودیوں کی عظمت کی خوشخبری دی تھی۔ یہ خیمہ خالص سونے کے تاروں سے بنایا گیا ہے، اس ملینر (Millineare) نے اس خیمہ کو تیار کر کے "نیتاہو" کو بطور ہدیہ پیش کیا تھا، یہ اس شمعدان کے علاوہ ہے جس کے لئے اس ملینر نے پندرہ ملین امریکی ڈالر خرچ کئے (دیکھئے روزالیوسف ۱۸/۸/۱۹۹۷ء)۔

بڑے تاریخی شمعدان کے بارے میں یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ۵۸۶ ق م میں جب بختصر نے بیت المقدس کو جلایا تھا، تو وہ محفوظ رہ گیا تھا لیکن مل نہ سکا، صدیوں سے یہودی اس کے حصول کے خواب دیکھ رہے ہیں، اور بعض پیشین گوئیوں کے انتظار میں اس کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں، موجودہ دور میں پھر اس کی تلاش کی مہم تیز ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ اسرائیلی ایجنسیوں کے لوگ ۹۰ کی دہائی میں "ویٹیکان" (Oatican) کے گوداموں کے تجسس میں ہر حدود کو پار کرگئے کیونکہ ان کو یہ خبر ملی تھی کہ "ویٹیکان" کے کسی گودام کی دہلیز میں "شمعدان" موجود ہے۔

واقعہ آیا گیا ہوگا۔ لیکن موجود یہودی مفقود "شمعدان" فراموش نہ کرسکے ماہ ستمبر ۱۹۹۵ء میں اسرائیل مذہبی امور کے وزیر "شمعون شہریت" کی پوپ جان پال دوم سے ملاقات ہوئی، اور انہوں نے ان سے اس قدیم مقدس شمعدان کی تلاش وجستجو میں مدد طلب کی جس کا وزن ۶۰ کیلوگرام سونے کا تھا (دیکھئے اخبار "السیاست" کویت ۳۰/۷/۱۹۹۷ء) یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ شمعدان شاہ نائیٹس کے دور میں جس نے ۷۰ء میں ہیکل کو منہدم کیا تھا۔ روم لایا گیا تھا۔

تابوت!؟

ایک اور کہانی ہیکل سے تعلق رکھتی ہے، جس کے گرد بڑی بحث چل رہی ہے وہ "تابوت" کی کہانی ہے، وہ تابوت جو حضرت موسیٰ کے زمانے میں تھا، اور جس کو حضرت سموئیل کے زمانہ میں فرشتوں نے بنی اسرائیل کے علاقہ میں پہونچایا تھا تاکہ حضرت طالوت کا استحقاق بادشاہت ثابت ہوسکے، برحق ہے، اس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے، لیکن یہودی افسانوی تابوت کچھ اور ہے، یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ تابوت انہیں دوبارہ حاصل ہوگا، جو دشمنوں سے معرکہ آرائیوں میں ان کے ساتھ رہیگا اور انہیں اس کی وجہ سے فتح حاصل ہوگی، کیا آپ جانتے ہیں کہ یہودی دوبارہ اس تابوت کو دریافت کرنے میں لگے ہوئے ہیں، تابوت کی تلاش آج "سن دو ہزار کے بخار" کی ایک کیفیت کی نمائندگی کرتی ہے۔

یہودی روایات بتاتی ہیں کہ تابوت ہیکل میں مقام "قدس الاقداس" میں رکھا تھا، اس میں تورات کی تختیاں اور دیگر متروکات حضرت موسیٰ و حضرت ہارون تھے، اتنی بات قرآن سے بھی ثابت ہے، لیکن بنی اسرائیل کے دور کے خاتمہ کے ساتھ یہ علائش بھی ختم ہوگئیں، اگر ان کی فضیلت باقی تھی تو امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی وارث ہوتی، جس طرح امت مسلمہ کو مسجد اقصیٰ کی میراث ملی، اور سرزمین مقدس ان کے قبضہ میں آئی۔

لیکن ہر حال میں یہودی اس کے قائل ہیں

کہ ہیکل میں تابوت بھی ضروری ہے تاکہ اس کی دینی حیثیت پوری طرح مکمل ہوجائے۔ لیکن تابوت ہے کہاں؟

اس کی کہانی ایک اور ہے۔۔۔۔

اسرائیلی اخبار "معاریف" فروری ۱۹۹۷ء کے شمارہ میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ "عہد کا تابوت اتھوپیا میں موجود ہے، اور محکمہ آثار قدیمہ اور یہودی تاریخ کے ایک ماہر کا یہ قول بھی نقل کیا گیا کہ بنی اسرائیل (علیہ السلام) کے بیٹے فلیک نے جو ملکہ بلقیس سے پیدا ہوئے تھے، تابوت کو والد کی وفات کے بعد حبشہ (اتھوپیا) منتقل کردیا تھا مقالہ نگار نے ان واقعات کو تورات کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہیکل تابوت کے بغیر بے معنیٰ ہے، اور تابوت مسجد اقصیٰ کے نیچے نہیں دفن ہے جیسا کہ بعض یہودی تنظیمیں سمجھتی ہیں، تلاش وکھدائی کی تمام کوشش ہرگز کسی نتیجہ تک وہاں نہیں پہونچ سکتیں"۔

اخبار نے مقالہ نگار کی ان "تحقیقات" کو نقل کرنے کے بعد لکھا تھا "عہد کا تابوت اتھوپیا کے شمال میں "شہر اقسوم" جو حبشہ کا قدیم سلیمان وملکہ بلقیس کے زمانہ میں دارالخلافت تھا اور جس پر فلیک کی حکومت اپنی والدہ کے بعد ۲۵ سال تک قائم رہی، کے قریب ایک پوشیدہ جگہ پر موجود ہے۔

پھر اخبار نے مزید لکھا تھا:

"سوائے چند بڑے ذمہ داروں کے کوئی بھی اس پوشیدہ جگہ سے واقف نہیں ہے"

تابوت کی جگہ کے سلسلہ میں ایک اور رائے ہے، جو کئی یہودی تنظیموں میں رائج ہے اور یہ کہ تابوت "قدس الاقداس" کے نیچے زمین کی گہرائی میں موجود ہے، یعنی اس زمین کے نیچے جس پر "قبۃ الصخرہ" بنا ہوا ہے، یہی رائے زیادہ تر تسلیم کی جاتی ہے، اور اسی بناء پر مسجد اقصیٰ کے اردگرد اراضی کے نیچے کھدائی کا کام شروع کیا گیا تھا کہ یہودی مسجد کے دالانوں میں داخل نہ ہوں مبادا ان کا پیر اس جگہ پر پڑ جائے جس کے نیچے تابوت ہو۔

بہرحال دونوں صورتوں میں تابوت کی تلاش جاری ہے اور اس کا حصول ان کے نزدیک ضروری ہے تاکہ تورات کی تختیاں اور دیگر "مقدس اشیاء" ہاتھ لگ سکیں۔

مسجد اقصیٰ کے نیچے یہودی آثار قدیمہ کے دعووں کے بعد بعض اخبارات نے ایک یہودی تنظیم کے ان دعووں کو بھی نقل کیا کہ اہرام کے نیچے بھی یہودی آثار قدیمہ ہیں، اس تنظیم کا کہنا ہے کہ حضرت داؤد کے مزامیر (زبور) جس کو یہودی مصر لے کر گئے تھے "اہرام" کے نیچے دفن ہے جس کی تعمیر میں یہودی سے بیگار لیا گیا تھا۔ (دیکھئے اخبار الخلیج ۵/۲/۱۹۹۹ء)

ذرا غور فرمائیں ایک طرف یہودیوں کا یہ جنون ہے اور قدیم ماضی کی دریافت اور مذہبی آثار کی تلاش میں وہ جان ودل سے لگے ہیں، دوسری طرف مسلمان ہیں جنکی سیاست کو دین سے دور رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے اور جن کے دشمنوں کے ایجنٹ و نمائندہ لیڈران سیکولرزم (لادینیت) کا کلمہ پڑھنے نہیں تھکتے۔

بعض اخبارات نے یہ خبر شائع کی تھی کہ یاسر عرفات نے اسرائیلی حکومت کی طرف ہیکل کے نقشہ کی تصاویر جو مسجد اقصیٰ کی جگہ پر قائم کیا جائیگا، عرب لیگ کی مجلس اور لجنۃ القدس (قدس کمیٹی) کے ممبروں کے سامنے پیش کیں۔ اور "روز الیوسف" میگزین کے شمارہ ۵/۵/۱۹۹۷ء میں یہ خبر بھی شائع ہوئی، کہ یاسر عرفات نے حسنی مبارک کو یہ تصویریں دکھائیں، اور مصری صحافی عادل حمودہ کا بیان ہے کہ یاسر عرفات نے قاہرہ میں متعدد صحافیوں سے ملاقات کے دوران مسجد اقصیٰ کو منہدم کرنے کے اسرائیلی منصوبہ کی تفصیلات سے انہیں آگاہ کیا، اور انہوں نے صحافیوں سے یہ بھی کہا کہ دنیا کے یہودیوں نے ایک پروجکٹ یعنی تیسرے ہیکل کی تعمیر کے لئے ایک ملین ڈالر کا چندہ دیا ہے،

۵/۳/۱۹۹۷ء میں اخبار "الحیاۃ" نے ۳/۳/۱۹۹۷ء میں لکھا کہ حسنی مبارک نے نیتاہو کی قاہرہ آمد کے موقعہ پر ملاقات کے دوران اسرائیلی حکومت کے تیارہ کردہ وہ نقشہ جات دکھائے جو تیسرے ہیکل سے متعلق ہیں، اخبار کا کہنا ہے کہ مصر کے باخبر ذرائع کا بیان ہے کہ نتیاہو نے حسنی مبارک کے سامنے ان منصوبوں اور مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کی جگہ ہیکل سلیمان کی تعمیر کے نقشوں کا انکار نہیں کیا۔

نتیاہو نے ۱۹۹۷ء میں کرسمس کے موقعہ پر تیسرے ہیکل کا ماڈل روم کے بشپ "مائکی موس شیالوم" کو ہدیہ پیش کیا تھا، وہ ماڈل چاندی کے ایک نقشہ پر دکھایا گیا تھا، جس میں شہر قدس دونوں مسجدوں سے خالی دکھایا گیا تھا۔

جب فلسطینیوں کی طرف سے اس پر اعتراض ہوا تو ترجمان نے ایک ایجنسی کو بیان دیا "ہم اس غلطی پر معذرت خواہ ہیں ہم غور نہیں کرسکے کہ ماڈل میں مسجد اقصیٰ کو ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔" (دیکھئے اخبار "الحیاۃ" ۱۳/۱/۱۹۹۷ء)

یہاں ایک بات اور اہم باقی رہ گئی ہے، کہ یہودی جس کو "مقدس مذبح" کہتے ہیں اور جس کا "ہیکل" کی روایات سے گہرا تعلق ہے، باقاعدہ تیار کیا جاچکا ہے، ہیکل کی بازتعمیر کی تحریک نامی تنظیم نے بحریت (Dead Sea) کے قریب ایک علاقہ میں یہ مذبح بنالیا ہے، اور وہ اس طرز پر بنایا گیا ہے کہ کسی بھی مناسب وقت پر اسے منتقل کرکے ہیکل کی تعمیرات کے درمیان میں بجادیا جائے گا۔

الخلیج اخبار نے ۱۶/۱۱/۱۹۹۷ء میں یہ خبر شائع کی تھی کہ معدنیات سے متعلق صنعتوں کی اسرائیلی کمپنی نے اس پروجکٹ میں حصہ لیا اور اس کے معدنی اجزاء کو تیس میٹر کی لمبائی میں اسی طرح اس نے تیار کیا ہے جیسا کہ عہد قدیم میں "مذبح" تھا، اخبار نیوز ایجنسیوں کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ "بحریت" کے قریب اس تیار شدہ مذبح قدس کے "ہیکل اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ" کے ہال میں رکھنے کی بات ہوئی تھی لیکن امن و امان کی صورتحال بگڑنے کے اندیشہ سے اس کو موخر کردیا گیا، اور اردن کے حدود کے محاذات میں ایک

خاص محفوظ جگہ پر اسے رکھا گیا ہے۔

آخر مذبح کی تیاری میں اتنی جلدی کیوں؟!

تعمیر سے پہلے مذبح کی تیاری میں جلدی کس لئے؟ اس میں کیا ذبح کیا جائے گا؟

اجمالاً جواب یہ ہے کہ یہودیوں نے مذبح ایک اور افسانوی حصہ کے ڈرامہ کو اسٹیج کرنے کے لئے تیار کیا ہے، جو ۲۰۰۰ء سے متعلق افسانوں کا ایک حصہ ہے وہ افسانہ "سرخ ودسویں گائے" کا ہے۔

ایک اہم بنیادی ضرورت

اس ایمان سوز دور میں معصوم بچوں کے ذہنوں کو کفر و شرک کے زہریلے اثرات سے کیسے محفوظ رکھا جائے اور ان کے دل و دماغ میں ایمان کی تخم ریزی کیسے کی جائے تا کہ وہ بچے مستقبل میں ایک سچے اور پکے مومن کی حیثیت سے زندگی گزار سکیں۔ اس کے لئے آپ مکتبہ دین و دانش مکارم نگر لکھنؤ سے فوراً رابطہ قائم کیجئے۔ مکتبہ نے چھوٹے بچوں کے لئے بہت ہی دلچسپ اور آسان زبان میں یہ کورس تیار کیا ہے جو ہزاروں مدرسوں میں آزمایا جا چکا ہے۔

مکمل سیٹ سو روپئے ڈاک خرچ مزید ۳۰ روپئے تاجروں کے لئے خصوصی رعایت (بعد کمیشن) پانچ ہزار کی نقد خریداری پر ۴۰ فیصد رعایت۔ پیشگی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ "Maktaba Deen-Wa-Danish" کے نام روانہ کیجئے۔

مکتبہ دین و دانش مکارم نگر لکھنؤ

فون: 0522-327970 موبائل: 9415005204

دینی مدارس واسکولوں کی اہم ضرورت کی تکمیل

(از: محمد الیاس ندوی بھٹکلی، استاذ جامعہ اسلامیہ بھٹکل کرناٹک)

اسلامی جغرافیہ

جغرافیہ وسائنس کا سرکاری نصاب اس کے مرتب کرنے والوں کے مخصوص فکری وثقافتی مزاج کی وجہ سے مسلم طلباء کے لئے نہ صرف ناکافی بلکہ نقصان دہ ہے۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ دینی مدارس ومسلم اسکولوں کے طلباء کے لئے ایک ایسا جامع نصاب مرتب کیا جائے جس میں بین الاقوامی جغرافیائی معلومات اسلامی نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے فراہم کی گئی ہو،

"بین الاقوامی و اسلامی جغرافیہ"

اسی سلسلہ کی ایک اہم کوشش ہے، بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ یہ کتاب ظاہری وباطنی دونوں حیثیتوں سے خوب ہے اور اس قابل ہے کہ مدارس واسکولوں میں پڑھائی جائے۔ اس وقت یہ کتاب خود دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس کے ملحقہ اداروں کے درجہ عالیہ اولی یعنی پنجم عربی کے علاوہ ملک کے مختلف مدارس واسکولوں میں بھی داخل نصاب ہے، ہندو پاک سے پانچواں ایڈیشن جدید اضافوں کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

ہندوستان اور مسلمان

یہ کتاب ملک کی تاریخ، جغرافیہ اور شہریت پر مشتمل ہے اور خصوصی طور پر مسلم طلباء کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے، اس کے مقدمہ میں قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ہندوستان کے بارے میں مسلمانوں کے حوالہ سے ہر قسم کی معلومات کا انسائیکلو پیڈیا ہے، ملک کے مختلف مدارس میں یہ کتاب بھی داخل نصاب ہے، تیسرا ایڈیشن نئی معلومات اور اضافوں کے ساتھ۔

مسلم دنیا (ماضی اور حال)

عالم اسلام کے حالات اور معلومات پر مشتمل اس کتاب میں ماضی وحال کی روشنی میں مسلم دنیا کی تاریخی، تعلیمی، سماجی، اور اقتصادی حالت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

حضرت مولانا محمد رابع صاحب ندوی مدظلہ العالی ناظم ندوۃ العلماء کے گرانقدر مقدمہ کے ساتھ تیسرا ایڈیشن

ہندوستان میں ناشر: مکتبہ الحسنات، ۲۲۴۱ کوچہ جیلان، دریا گنج نئی دہلی

پاکستان میں ناشر: مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی۔

ملنے کا پتہ: دارالعلم، ۳۱/محمد علی روڈ، بھٹکل (کرناٹک)

امریکہ، مشرق وسطیٰ اور صدام حسین: ایک تجزیہ

مولانا نذر الحفیظ ندوی

یہودی منصوبہ ساز کیسنجر کے مشورے اور تجاویز کی تنفیذ کی کوشش بش اور کلنٹن کے دور میں کی جاتی رہی، اسی دوغلی پالیسی پر امریکہ و برطانیہ اب بھی عمل پیرا ہیں، خلیجی جنگ کے خاتمہ پر بش نے عراقی عوام کو صدام کے خلاف بغاوت کی دعوت دی اور بڑے پیمانے پر ہوائی جہازوں سے اشتہارات گرائے گئے جن میں کہا گیا کہ امریکہ کو عراقی عوام سے ہمدردی ہے ان کے مصائب کا اصل سبب صدام ہیں ان کو معزول کرنا امریکہ کا بنیادی مقصد ہے، امریکہ نے جنوبی عراق کے شیعوں کی مالی مدد کی اور اسلحہ بھی مہیا کیا انہیں فوجی ٹریننگ بھی دی، لیکن جب شیعوں نے صدام کے خلاف شورش برپا کی تو بش نے شیعوں کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شیعی بغاوت کے ممتاز قائدین کے نام اور ان کے ٹھکانوں کے بارے میں ساری معلومات امریکہ نے صدام کو مہیا کر دئے نتیجہ یہ ہوا کہ صدام حسین نے ایک ایک کر کے اپنے تمام مخالفین کو ٹھکانے لگا دیا، خود امریکی سی۔آئی۔اے کی ایک رپورٹ اخباروں میں شائع ہوئی جس میں بتایا گیا تھا کہ دس سال کے اندر گیارہ بار صدام کے خلاف سازش بڑی مہارت سے تیار کی گئی مگر ہر بار عین وقت پر سی۔آئی۔اے نے عراقی حکام کو سازش سے باخبر کر دیا اور سازش کرنے والوں کے نام حکومت کو دیدیے۔ اس وقت بھی گذشتہ سالوں کی طرح لندن میں امریکہ و برطانیہ کی سرپرستی میں صدام کے مخالفین کی میٹنگ ہو رہی ہے اس میں بھی یہی طے کیا گیا ہے کہ صدام کا تختہ الٹ دیا جائے چنانچہ تازہ خبروں کے مطابق امریکہ و برطانیہ نے عراق کے خلاف مشترک جنگی اقدام کی تیاری کر لی ہے، اشتہارات گرائے جا رہے ہیں ان میں بھی بدستور طوطے کی طرح یہی رٹ لگائی جا رہی ہے کہ صدام کے خلاف عراقی عوام بغاوت کر دیں دوسری طرف امریکہ عراق کے خلاف فضائی اور زمینی حملوں کی زبردست تیاری کا پروپگنڈہ کر رہا ہے ساتھ ہی یہ بھی کہہ رہا ہے کہ صدام نے ایسے خفیہ مقامات پر جراثیمی ہتھیار چھپا رکھے ہیں جہاں تک پہنچنا ہمارے بس کی بات نہیں اور نہ ہمارے گائیڈ میزائل ان کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یہ خبر بھی دی جا رہی ہے کہ اس جنگ میں کھربوں ڈالر یومیہ کے اعتبار سے امریکہ کے خرچ ہوں گے ان سب خبروں اور جنگی فضا میں گرمی کے باوجود صدام بدستور بغداد کے شاہی تخت پر براجمان امریکہ کو چیلنج پر چیلنج دیتے جا رہے ہیں امریکہ کے مخالفین خوش ہو رہے ہیں اور فخر کر رہے ہیں کہ ہے تو کوئی مائی کا لال جو امریکہ جیسی سپر پاور کو چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ادھر صدام نے بھی امریکہ کی طرح کویت کو قتل کرنے کے دس سال بعد اس سے اپنے جفاؤں کی معافی مانگنے اور قرآن وحدیث کے حوالے سے معافی کی فضیلت پر تقریروں کا آغاز کر دیا ہے۔

کچھ تعجب نہ ہوگا اگر یہ خبر آجائے کہ صدام حسین کویت وسعودی عرب کے دورے پر جا رہے ہیں تا کہ وہ اس مصیبت کی گھڑی میں بھی ان سے مدد طلب کریں اور قرآن وحدیث کا حوالہ دے کر اپنے کو سلطان صلاح الدین ایوبی کی صف میں کھڑا کر دیں، اقوام متحدہ کے تفتیشی افسروں کو پہلے کی طرح جاسوس کہہ کر نکال باہر کرنے کا اعلان کر دیں، اس طرح کے ڈرامے ۱۹۹۷ء اور ۱۹۹۸ء میں صدام کر چکے ہیں دوسری طرف امریکہ برطانیہ صدام سے خوف زادہ ہو کر جنگی اقدامات سے باز رہنے کا اعلان کر دیں، اقوام متحدہ کے حوالے سے ایسی خبریں کئی روز سے شائع کی جا رہی ہیں جن میں کہا جا رہا ہے کہ فی الحال جنگ کا امکان نہیں جب تک کہ سلامتی کونسل کو تفتیشی افسران کی رپورٹ موصول نہ ہو جائے۔

عرب ممالک بھی نہیں اب تو پوری دنیا کو شک ہونے لگا ہے کہ مقصود عراق پر بمباری کرنا یا صدام کو گرانا نہیں اس لئے کہ کسی ملک پر بمباری کر کے اس کے حکمراں کو گرایا نہیں جا سکتا، کیسنجر کے منصوبے کے جس چیز کی ابھی تک تنفیذ نہیں ہو سکی ہے وہ امریکہ کی طرف سے فوجی مداخلت سے گریز ہے۔ اس لئے کہ امریکہ کو کمزور و پراگندہ اور منتشر و منقسم عراق پسند ہے بجائے اس کے کہ صدام کو گرایا جائے پنٹاگن کے فوجی، ماہرین نے کلنٹن کو مشورہ دیا تھا کہ اگر امریکہ عراق میں فوجی مداخلت کرے گا تو ویتنام کی طرح اس کا قوی اندیشہ ہے کہ فوجی کارروائی زیادہ وقت لے، ایسی صورت میں غیر معمولی مالی اور جانی نقصانات ہوں گے، اس لئے کہ اگر امریکہ براہ راست خود فوجی اقدامات کرے گا تو اس کی فوج آسانی سے عراقی فوجیوں کا نشانہ بن جائے گی ایسی صورت میں امریکہ کو چاہئے کہ وہ عراق کے پڑوسیوں

غیبت ہر برائی کی جڑ ہے۔ صفحہ کا بقیہ

سے مدد لے، لیکن امریکی جنرل انتھونی زینی نے اس مشورہ کو مسترد کر دیا کہ کوئی عرب عراق کے خلاف امریکہ کے لئے اپنی فوج بھیجنے کے لئے تیار نہیں ہوگا اگر امریکی فضائیہ کے بجائے بری فوج حملہ کرے گی تو اس کا اندیشہ ہے کہ عراق اپنے جراثیمی ہتھیار استعمال کر ڈالے، اس وقت بھی امریکہ و برطانیہ اس کشمکش سے دوچار کاغذی جنگ پر اکتفا کر رہے ہیں امریکی وزیر دفاع ڈونالڈ رمسفیلڈ امریکہ کے جنگی جنون کو بڑھانے اور عراق کے خلاف بندھ باندھنے اور چاروں طرف سے اس کو گھیرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں، حال ہی میں قطر کے ساتھ امریکہ نے معاہدہ کیا ہے تا کہ اس کو فوجی مستقر بنا کر عراق کے خلاف کارروائی کی جائے یہ ڈونالڈ رمسفیلڈ وہی بزرگ ہیں جو ریگن کے دور صدارت میں ایران کے خلاف عراق کو فوجی مدد دینے کے لئے عراق تشریف لے گئے تھے اور صدام کو انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ ایران کے خلاف جراثیمی ہتھیار استعمال کیا جائے صدام کے یہ جنگی مشیر اب اپنی ساری صلاحیتیں عراق کو ختم کرنے پر صرف کر رہے ہیں یہ کارنامہ صدام حسین کا ہے یا امریکہ کا یا دونوں کا مشترکہ۔

امریکہ اور عراق کے درمیان روایتی دشمنی کی خبروں کے درمیان جو خبریں آتی رہتی ہیں ان کی طرف کسی کا ذہن نہیں جاتا اور نہ ہی ان کے پس منظر اور مقاصد پر غور کیا جاتا ہے اور نہ ان کے گہرے اور دوررس اثرات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر عراق کے نائب وزیر اعظم اور مشہور مسیحی مبلغ ڈاکٹر طارق عزیز نے اقوام متحدہ میں ۱۹۹۴ء کے جولائی کے اواخر میں تقریر کرتے ہوئے اپنے ملک کی طرف سے یہ پیشکش کی تھی کہ عراق کویت کے ساتھ سرحدوں کے اختلافات دور کرنے کے لئے تیار ہے اور وہ اسرائیل کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا بلکہ اس کے ساتھ اقتصادی اور سفارتی تعلقات قائم کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس بیان کے بعد ہی دونوں ملکوں کے نمائندوں نے نیویارک میں ملاقاتیں کیں چنانچہ اسرائیلی روزنامہ یدیعوت احرونوت نے ملاقاتوں کی رپورٹ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اسرائیل نے عراق کو باقاعدہ یہ پیشکش کر دی ہے کہ وہ بغداد میں اپنا سفارت خانہ کھولنے اور عراق سے تجارتی تعلقات قائم کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہے اور مزید یہ بھی کر سکتا ہے کہ امریکی سرمایہ کاروں کو اس بات کے لئے تیار کر دے کہ وہ عراق میں سرمایہ کاری کریں، اسرائیلی ٹیلیویژن نے اپنے نمائندہ کے حوالے سے یہ خبر دی کہ عراق نے ایک پیغام تل ابیب کو بھیجا ہے جس میں اس نے اس بات پر آمادگی ظاہر کر دی ہے کہ وہ دونوں ملکوں کے درمیان امن معاہدہ کرنے کے لئے تیار ہے اس خبر کے بعد یہ اطلاع بھی آئی کہ صدام نے اپنے چھوٹے صاحبزادہ قصی کو اسرائیل سے تعلقات کی بحالی کا انچارج بنا دیا ہے اور وہی یہ فائل دیکھ رہے ہیں یہ بات تو عراق ایران جنگ کے درمیان آ چکی تھی کہ عراق اسرائیل سے براہ راست اسلحہ حاصل کر رہا تھا اس وقت عراق نے اسرائیل کو یہ یقین دہانی کرادی تھی کہ وہ فلسطینیوں کو اپنے یہاں بسانے کے لئے تیار ہے تا کہ اسرائیل کا دردسر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ مگر اسرائیل ابھی تک دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر گامزن ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ عرب اسرائیلی کشمکش میں عراق کوئی کردار ادا کرے، اس لئے امریکہ اور اس کے حلیف ممالک کی پوری کوشش یہی ہے کہ تمام مسلم ممالک کمزور، پراگندہ، منتشر اور منقسم اور سیاسی بے یقینی کا شکار رہیں اس لئے کہ اس پالیسی کی کامیابی پر امریکہ کی کامیابی اور اس کے سپر پاور بنے رہنے کا انحصار ہے۔

چاہتے ہیں کہ جو جنت بہت زیادہ قربانیوں سے حاصل ہوتی ہے اللہ کے بندوں کے زبان کے چند ناموزوں بول سے اسے مت ضائع کرو، یا در کھو زبان کی برائیوں میں پڑے رہنے والے جنت میں نہیں جائیں گے۔ آپ کا ارشاد ہے :

هل يكبّ الناس إلا حصائد السنتهم

(جہنم میں جو لوگ جائیں گے ان میں بہت سے اپنی زبانوں کے شہید ہوں گے)

اور زبان کا جو تیر گھائل کر کے آدمی کو جہنم میں ڈالے گا غیبت ان میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب مرحومؒ نے ''معارف القرآن'' میں ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اس حدیث کو خوب سمجھا جا سکتا ہے حضرت میمون بن مہران فرماتے ہیں کہ ایک روز خواب میں میں نے دیکھا کہ ایک حبشی کا مردہ جسم ہے اور کوئی کہنے والا مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اس کو کھاؤ میں نے کہا خدا کے بندے میں اس کو کیوں کھاؤں؟ اس نے کہا کہ تو نے فلاں کے زنگی غلام کی غیبت کی ہے میں نے کہا کہ خدا کی قسم !! میں نے تو اس کے متعلق کوئی اچھی بری بات کی ہی نہیں۔ تو اس شخص نے کہا ہاں لیکن تو نے اس کی غیبت سنی تو ہے اور اس پر راضی رہا۔ حضرت میمون کا حال اس خواب کے بعد یہ ہو گیا کہ نہ خود کسی کی غیبت کرتے اور نہ ہی اپنی مجلس میں کسی کی غیبت کرنے دیتے تھے۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر غیبت سننا اتنا سنگین جرم ہے تو غیبت کرنے کا عذاب کیا ہوگا؟

ترمذی میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہے :

الغيبة أشد من الزنا

(غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے)

اس لئے کہ زنا صدق دل سے توبہ کر لینے پر معاف ہو جاتا ہے اور غیبت اس وقت تک معاف نہ ہوگی جب تک جس کی غیبت کی گئی ہے وہ نہ معاف کر دے اللہ حفاظت فرمائے۔ آمین ☆☆☆☆☆

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی کی کتاب ''تکبیر مسلسل'' کے رسم اجراء پر

روزنامہ صحافت کا اداریہ

ایک مرد مومن کا صدقۂ جاریہ

اسلامی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ ملت کی زندگی میں جب بھی نازک مرحلے آئے۔ مشیت الٰہی سے دردمند اور مخلص افراد پیدا ہوتے رہے ہیں اور ملت کو درپیش مسائل کے حل کے لئے بے لوث اور سرگرم خدمات انجام دینے کے لئے آگے آتے رہے ہیں۔ جن کو نہ کسی صلے کی تمنا رہی اور نہ ستائش کی آرزو۔ ان کے لئے ان کا کام ہی سب سے بڑا انعام رہا ہے۔ انجمن تعلیمات دین کے بنیاد گذار اور دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے بانی قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم ملت کے ایسے ہی قابل فخر افراد میں سے تھے، جنہوں نے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کی اشاعت و ترویج اور بنیادی تعلیمی سطح پر اردو زبان و ثقافت سے مسلمانوں کا رشتہ مستحکم رکھنے کے لئے تعلیم دین کی ایک ایسی تحریک کی بنا ڈالی جو ایک صدقۂ جاریہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے تحت اتر پردیش میں قائم ہزاروں مدارس دین کی تعلیم اور پرائمری سطح پر اردو کی تدریس کا بے حد اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

قاضی صاحب مرحوم نے جب اپنے آبائی وطن ضلع بستی میں ۱۹۵۰ء میں انجمن تعلیمات دین کی بنیاد ڈالی تو اردو کو اسکولوں سے تقریباً جلاوطن کر دیا گیا تھا اور نصاب تعلیم، اسلام مخالف مضامین اور اسباق سے بھر دیا گیا تھا، اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لئے قائم اس انجمن کے دو سب سے بڑے مقاصد تھے ریاست میں مسلمانوں کے آزاد اور خود کفیل مکاتب کھول کر بچوں کے ذہنوں سے سرکاری نصاب تعلیم کے اسباق کے زہریلے اثرات کو مٹانا اور جمہوری اور آئینی طریقوں سے یہ جدوجہد کرنا۔ ظاہر ہے کہ انجمن کے ان مقاصد کی کامیابی کے لئے رضا کارانہ بنیادوں پر ملت کے اپنے معمولی سے وسائل کو یکجا کر کے اور ایثار و لگن کا ثبوت دے کر مکاتب چلانا اور مسلک اور عقائد کے فروعی اختلافات سے بالاتر ہو کر ملت میں اس بڑے کام کے لئے جذبہ اتحاد پیدا کرنا۔ یہ دونوں ہی کام مسلم ملت کی اقتصادی زبوں حالی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلافات کے پیش نظر آسان کام نہیں تھے لیکن جب دین و ملت کا کام کرنے کے لئے ایثار اور خلوص کا جذبہ دل میں موجود ہو تو اللہ کی طرف سے تائید اور نصرت بھی آتی ہے اور اسی تائید غیبی کا نتیجہ ہے کہ قاضی عدیل عباسی کو اپنی کوششوں میں حضرت مولانا ابو الحسن علی ندویؒ، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری، مولانا ہاشم میاں فرنگی محلی، قاضی جلیل عباسی مرحوم جیسے سرکردہ دینی و ملی رہنماؤں اور مسلمانوں کے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے علماء کا پورا تعاون اور اشتراک عمل حاصل رہا اور انجمن کے تحت قائم اتر پردیش دینی تعلیمی کونسل نے جو بیج بویا تھا وہ بحمد اللہ تناور درخت بن چکا ہے۔ انجمن کے موسسین کی حالات وقت کی بصیرت اس سے ظاہر ہے کہ ملت کو تعلیم دین اور زبان و ثقافت کے تحفظ کو درپیش جن خطرات کی سنگینی کا اندازہ آج سے ۵۰/۵۲ سال پہلے کیا گیا تھا وہ خطرات آج بھی موجود ہیں اور اسی لئے دینی تعلیمی مدارس کی اہمیت آج بھی قائم ہے۔

ملت اسلامیہ کے دین و ثقافت کے تحفظ کی اس انتہائی اہم تحریک کی تاریخ مرتب کرنا خود ملت کی ایک بہت بڑی خدمت ہے اور قاضی عدیل عباسی مرحوم اور قاضی جلیل عباسی مرحوم کے خانوادے کے لائق رکن اور تحریک کے مخلص مجاہد مولانا محمود الحسن مرحوم کے فرزند ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی سکریٹری دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش نے دینی تعلیمی کونسل کے محترم صدر مولانا ابو الحسن علی ندویؒ کی ان تقاریر اور خطبات کو ''تکبیر مسلسل'' کے عنوان سے مرتب اور شائع کر کے، جو مولانا علی میاںؒ نے چالیس سال کی طویل مدت تک دینی تعلیمی کونسل کے صدر کی حیثیت سے مختلف موقعوں پر دیئے تھے، نہ صرف اسلاف کے ورثہ دار ہونے کا حق ادا کیا ہے بلکہ ملت کی ایک بہت اہم دعوتی و علمی خدمت بھی کی ہے۔ اس یادگار کتاب کا اجراء گزشتہ اتوار کو ندوۃ العلماء کے سربراہ اور حضرت مولانا علی میاںؒ کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی صدارت میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں منعقدہ ایک نمائندہ

بقیہ: صفحہ ۲۲ پر

کاش شعروادب

﴿جلوۂ جاناں جاناں﴾

کلیم عاجزؔ کے تازہ مجموعہ ''منظومات'' کا تعارف

● پروفیسر محسن عثمانی ندوی

غزل نیم وحشی صنف سخن سہی لیکن اردو شاعری کی آبرو اسی صنف سخن سے قائم ہے۔ تمام اصناف سخن میں اس کو جو شہرت ملی اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور صنف کو حاصل نہ ہوسکی، اسی لئے مرثیہ گو شعراء تک جب مسدس کو چھوڑ کر سلام لکھنے بیٹھتے ہیں تو غزل کی زمین اختیار کرتے ہیں۔

شاہ فرماتے تھے پانی نہیں ملتا لیکن
سامنے آنکھوں کے لہراتا ہے دریا کیا کیا

جس طرح سے نظم گو شعراء نے اپنا میدان چھوڑ کر غزل سرائی کی ہے اسی طرح سے غزل گو شعراء نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ جہاں قطعیت اور صراحت کی ضرورت پیش آتی ہو وہاں نظم کا میدان موزوں ہوتا ہے کیوں کہ غزل کا مزاج کنایہ اور ابہام کا مزاج ہے نظم کے مقتضیات دوسرے ہیں اور غزل کے دوسرے۔ کلیم عاجزؔ ایک غزل گو شاعر ہیں اور انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے:

منظور ہو محفل کا گر رنگ بدل دینا
اک اچھے مغنی کو عاجزؔ کی غزل دینا

انہوں نے جگرؔ کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا ہے جو ان کے منظومات کے تازہ مجموعہ میں شامل ہے اس میں بھی انہوں نے غزل کا دفاع کیا ہے ان کے زمانہ میں یعنی جب ان کی شاعری کا عہد شباب تھا غزل کی مخالفت بہت شدید تھی۔ کلیم الدین کلیم نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا تھا، ایک دوسرے نقاد عظمت اللہ خاں نے غزل کو گردن زدنی قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے۔ ترقی پسند حلقوں سے غزل گوئی کی حوصلہ شکنی ہورہی تھی اور ترقی پسند ادب کے ترجمان رسالوں میں غزلوں کے لئے گنجائش بہت کم رکھی گئی تھی۔ اس صنف غزل کی سخت جانی کی باوجود آج بھی اس پر حملے جاری ہیں ایک ڈاکٹر سنت پال آنند نے ماہنامہ ''صریر'' کراچی میں اور ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی کے ۱۹۹۱ء کے شمارہ ۵ میں غزل کے خلاف مضمون لکھا ہے گویا یہ جہاد انگیزی اب بھی جاری ہے۔ ایک اور بزرگ عندلیب شادانی تھے ڈھاکہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو تھے انہوں نے اس وقت جگر کی غزل گوئی کے خلاف مضمون لکھا جب جگر کا طوطی بول رہا تھا۔ جگر مرادآبادی کے انتقال پر کلیم عاجزؔ نے مرثیہ لکھا اور غزل کی صنف نازک پر ان حملوں کی طرف اشارہ کیا

ساقی نے چوم کر لب پیمانہ غزل
کی ترک صحبت مے و میخانہ غزل
شمع غزل بجھی جلا پروانہ غزل
اب ہم ہیں اور لذت افسانہ غزل
زلف سخن میں کون کرے شانہ غزل
آئینہ توڑ کر گیا دیوانہ غزل
اب کیا رہے گی حرمت کاشانہ غزل
بے برہمن ہوا دربت خانہ غزل
جتنے غزل شکن ہیں جہاں میں پکار دو
آجاؤ اب کھلی ہوئی گردن ہے ماردو

غزل گو کلیم نے نظمیں بھی کہی ہیں اور ان کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے ان کی منظومات کا مجموعہ بالکل تازہ بتازہ شائع ہو کر ابھی منظر عام پر آیا ہے۔ انہوں نے ہر نظم کے ساتھ اس کے شان نزول کا تذکرہ بھی کردیا ہے، سرورق پر خون آلودہ سرزمین ہند کا نقشہ ہے۔ اس میں ان شہروں سے جہاں مسلم کش فسادات ہوئے خون ٹپکتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اور نام کتاب کے نیچے یہ درج ہے

خیریت سے ہے یہاں سرنہ دل وجاں جاناں
کوچہ جاناں نہیں کوچہ جاناں جاناں

انہوں نے اس کتاب کا انتساب اپنے وطن ہندوستان کے نام کیا ہے اور پھر نیچے اپنا یہ شعر بھی لکھ دیا ہے:

شہر خالی ہوا نہ قاتل سے
ایک جاتا ہے ایک آتا ہے

اس مجموعۂ کلام کا حسن آغاز نعتیہ کلام سے ہوتا ہے قطرۂ خون جگر یعنی داخلیت جو کلیم کے کلام کا امتیاز ہے وہ یہاں بھی موجود ہے عشق رسالت مآب کلیم عاجز کا قال نہیں حال ہے وہ تقریباً چالیس بار مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کا سفر کرچکے ہیں مکہ میں حرم شریف میں پے احترام کبھی چار زانو نہیں بیٹھتے، دیوار سے یا ستون سے ٹیک نہیں لگائی، مسجد نبوی میں فرط ادب سے مقدس جالیوں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکے، مسجد میں داخل ہو کر با ادب روضہ سے دور صف نعال میں جہاں جوتے رکھے جاتے ہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک بار کہنے لگے کہ ''کئی دن آئے ہوئے ہوگئے سلام کے لئے روضہ کے قرین حاضری کی ہمت نہیں پاتا ہوں'' کلیم عاجزؔ کی تمام نعتیں ان کے سوز نہاں کی آئینہ دار ہیں ایک نعت کے چند اشعار یہ ہیں:

زخم کھائے ہوئے سرتابہ قدم آئے ہیں
ہانپتے کانپتے یا شاہ امم آئے ہیں
آپ کے سامنے جس حال سے ہم آئے ہیں
ایسے مجرم کسی دربار میں کم آئے ہیں
کھو کے بازار میں سب اپنا بھرم آئے ہیں
شرم کہتے ہوئے آتی ہیں کہ ہم آئے ہیں
سرنگوں آئے ہیں بادیدہ نم آئے ہیں
آبرو باختہ دل سوختہ ہم آئے ہیں

اس کے بعد ایک سلام اور بارگاہ نبوی میں مناجات دیکھئے، کلیم عاجزؔ مسجد نبوی میں داخل ہوتے

ہیں ایک ستون سے اپنا سر لگائے ہوئے کھڑے ہوئے روتے ہیں اور یوں عرض گذار ہوتے ہیں:

شارٹوٹے ہوئے دل کا جام کرنے کو
کلیم آہی گیا پھر سلام کرنے کو
حضور یہ بے ادب بے شعور بے غیرت
کرے ہے صبح گناہوں میں شام کرنے کو
مگر بنا کے بڑی ہوشیاری سے بہروپ
چلا ہے تقویٰ گذاروں میں نام کرنے کو
اب آستانہ پر حاضر ہی ہوگیا تو اسے
قبول کیجئے قید دوام کرنے کو
ملازموں کو بلا کر سپرد کردیں اسے
سگِ غلام غلامِ غلام کرنے کو

مسلم کش فسادات ہندوستان کی پیشانی کا داغ اور ہندوستانی مسلمان اور ہر شریف انسان کے سینہ کا چراغ بنتے جارہے ہیں۔ ایک حساس شاعر جب مسجد نبوی میں سلام کے لئے حاضر ہوتا ہے تو وہ اپنے غموں کو نہیں بھولتا جب ایک اور شاعر ہندوستان میں حاجیوں کے قافلہ کو سوئے حجاز جاتے ہوئے دیکھتا ہے تو ان سے یوں کہنے لگتا ہے:

اے عازم دربار شہنشاہ مدنیہ
یاد آئیں اگر تجھ کو شہیدان جلیپور
کہنا بصد آداب کہ اے مرکز امید
بدلے گئے کیوں بارگہ ناز کے دستور

یہ تو حفیظ الرحمٰن واصفؔ (مفتی کفایت اللہ کے صاحب زادے) کے طویل نعتیہ کلام کے اشعار ہیں جو جبلپور کے فساد کے زمانہ میں خون دل سے لکھے گئے تھے۔ مرادآباد میں جب عین عید کے دن نماز عید کے بعد عیدگاہ میں قتل کا بازار گرم ہوا تو کلیم عاجزؔ نے باد صبا کے ذریعہ یہ پیغام بھیجا:

مدینہ پہونچ کر سر عام کہیو
صبا کملی والے سے پیغام کہیو
یہاں میکدہ کہتے ہیں قتل گہ کو
کہو سے بھرے جاتے ہیں جام کہیو
بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے
محرم کا اب عید ہے نام کہیو
یہ اشعار ان سے نہایت ادب سے
نگاہیں جھکا کر اور دل تھام کہیو

۱۹۷۹ میں جب جمشید پور میں فساد ہوا اس کے بعد کلیم عاجزؔ کو خود حاضری کا موقعہ ملا۔ اس وقت ان کے نعتیہ کلام میں ان فسادات کا عکس نظر آتا ہے۔

مدنیہ جب بھی گئے بس یہ کام کرکے چلے
سحر رونے کو بیٹھے تو شام کرکے چلے
تھا ایک ہاتھ کلیجہ پہ ایک آنکھ پر
دل و نگاہ کا برہم نظام کرکے چلے
بڑے سلیقہ سے آنکھوں نے ترجمانی کی
زباں کھلی نہیں لیکن کلام کرکے چلے

پھر جب میرٹھ میں مسلمانوں کا خون بہا اور کلیم عاجزؔ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے تو اپنی فریاد اس طرح پیش کی:

یہ سر کہ جس کا مول نہ تھا تاج قیصری
ہوتا ہے اب فروخت بہت سستے دام پر
اور سستے دام کی بھی ضرورت نہیں رہی
بے دام ہی تراش لئے جاتے ہیں یہ سر
گردن بریدہ پیرہن و جسم سوختہ
یوں بھی ہم آئے کوچہ دبازار میں نظر
محفل اجاڑ، شمع فسردہ، فضا خموش
بکھری ہوئی پتنگوں کی لاشیں زمین پر
کیا کیا گزر رہی ہے وہ کیا عرض ہم کریں
ہوگی ضرور حضرت والا کو سب خبر
رب کریم آپ کا اور آپ بھی کریم
اب درمیان دونوں کریموں کے ہے یہ سر
ہم سرنگوں ہیں اور معافی کے خواستگار
بس اک سخن بس ایک توجہ بس اک نظر

بلاشبہ کلیم عاجزؔ کی شاعری کا یہ امتیاز ہے کہ انہوں نے اپنے وطن عزیز کے جسم پر فسادات کے ناسور کی طرف توجہ دلائی ہے ان کی نظمیں، ان کے نعتیہ کلام، ان کی غزلیں ہر جگہ یہ موضوع چھایا ہوا ہے، انسان کی جان سب سے محترم ہے۔ اسلام نے ایک انسان کے قتل ناحق کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے، جو شاعر بھوک کا اور افلاس کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ ترقی پسند شاعر کہلاتا ہے، عوامی شاعر کہلاتا ہے، محنت کش طبقہ کا شاعر کہلاتا ہے۔ لیکن انسانی جان کا معاملہ بھوک اور افلاس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ فسادات اب ہندوستان کے ضمیر وخمیر کا جزو بنتے جارہے ہیں اور اس کثرت سے اور اتنے بڑے پیمانہ پر رونما ہونے لگے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اب ملک کی فطرت ثانیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ الزام خدا کرے مستقبل میں غلط ثابت ہو۔ لیکن ایک بڑا طبقہ ہے جسے ان فسادات پر کوئی شرمندگی نہیں محسوس ہوتی ہے۔ وہ اس پر فخر کرتا ہے اور سارے ملک میں اسے دہرانے کا عزم رکھتا ہے۔ کئی جگہ برسر اقتدار طبقہ بھی، انسانی جان ومال کی حفاظت جس کی ذمہ داری تھی، فسادات میں شریک رہتا ہے بلکہ اسی کے اشارہ پر فساد ہوتا ہے اور منصوبہ بند طریقوں سے گھروں کو لوٹا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کلیم عاجزؔ کا یہ کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس غم کو غم زمانہ بنادیا اور سیکڑوں غزلیں اس موضوع پر کہہ ڈالیں، اردو ادب اور شاعری کا کوئی مصنف اور حقیقت نگار مورخ کلیم عاجزؔ کے نام کو اور کلام کو نظر انداز نہیں کرسکتا ہے۔ انہوں نے ہندوستانی زندگی کے ایک اہم رخ کی بڑی فنکارانہ اور شاعرانہ عکاسی کی ہے۔ کوئی شخص اگر بیسوی صدی کے ربع اخیر کے نصف درجن بڑے شعراء کے دیوان کا انتخاب کرنے کے لئے کہے تو ایک منصف نقاد کلیم عاجزؔ کے مجموعہ کلام کو آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کرسکتا ہے۔

لال قلعہ میں ہر سال آزادی اور ملک میں جمہوریت کے قیام کی یاد میں جشن بہاراں منایا جاتا

ہے اور ایک آل انڈیا مشاعرہ کا نظم ہوتا ہے جس میں چوٹی کے اہل سخن اور ارباب کمال جمع ہوتے ہیں۔ اس مشاعرہ میں کلیم عاجزؔ کو بھی دعوت سخن دی جاتی رہی ہے۔ اس ملک کا شعراء پر حق ہے اگر وہ آزادی کے گیت گائیں اور خوشی کے ترانے سنائیں تو بجا ہے کہ یہ اسی کا موقعہ ہے۔ لیکن کلیم عاجزؔ کا گھر توعین بہار میں لٹا تھا اس سے خوشی کا نغمہ سننے کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے تھی یہ تو منتظمین کی غلط بینی اور غلط اندیشی ہے کہ انہوں نے دعوت نامہ بھیجا کلیم عاجزؔ مشاعرہ میں پہونچے اسٹیج پر لال بہادر شاستری جی موجود تھے اور کنور مہندر سنگھ بیدی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے شعراء کرام میں عرش ملسیانی، جوش ملسیانی، پنڈت تلوک چند محرومؔ، جگن ناتھ آزاد علی، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساغر نظامی، روش صدیقی، ساحر لدھیانوی، سہیل سعیدی، قدیر لکھنوی، نشور واحدی وغیرہ اسٹیج پر موجود تھے کلیم عاجزؔ نے مشاعرہ میں جو نظم پڑھی وہ منظومات کے تازہ مجموعہ ''کوچہ جاناں جاناں'' میں شامل ہے چند اشعار یہ ہیں:

یاران میکدہ یہ امامانِ بادہ نوش
یہ دشمن جنوں یہ پرستار عقل و ہوش
گندم نما یہ دوست یہ احباب جو فروش
باطن سیاہ کار بظاہر سفید پوش
یہ تاجران لالہ و گل تیغ در بغل
دیتے ہیں زخم کرتے ہیں فرمائش غزل
یہ جشن یہ جلوس یہ جلسہ یہ جلوہ گاہ
یہ شاعری یہ داد یہ تحسین یہ واہ واہ
یہ پیار کے معاملے یہ لطف کی نگاہ
سب جھوٹ، سب مغالطہ، سب جرم سب گناہ
شاعر ہیں راز ہائے دروں جانتے ہیں ہم
دنیا کو ہر لباس میں پہچانتے ہیں ہم

کلیم عاجزؔ کے اس مجموعہ کلام میں مولانا آزاد، جواہر لال نہرو، جمیل مظہری، شاد عظیم آبادی اور جگر مراد آبادی کے انتقال پر لکھے گئے مرثیے بھی ہیں، شب معراج اور جشن عید پر نظم ہے۔ وہ اپنے افتاد اور مزاج کے لحاظ سے شاعر ہیں، وہ اکتسابی شاعر نہیں بلکہ فطری اور وہبی شاعر ہیں، شعر کی نمود ان کے نہاں خانہ دل میں اس طرح ہوتی ہے جیسے برسات میں سبزہ اگتا ہے ان پر دل کا سخت دورہ پڑا ہے اسپتال میں سخت نگہ داشت کی حالت میں ہیں، گفتگو سخت منع ہے، اس حالت میں دل کے عنوان سے نظم کا درود ہو رہا ہے، ایک طویل نظم ہے جو عین حالت مرض میں تیار ہوتی جارہی ہے۔ ایسے ہی شاعر کو فطری شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کے یہاں اشعار کی آمد ہوتی ہے آورد نہیں۔ اشعار ساغر دل پر اس طرح اترتے ہیں جس طرح موسم سرما میں شب ماہتاب میں شبنم گلاب کے کٹوروں میں اترتی ہے۔

❁❁❁❁

بقیہ: ایک مرد مومن کا صدقۂ جاریہ

اور پروقار تقریب میں عمل میں آیا۔ جس کا ایک بہت قابل قدر پہلو یہ ہے کہ آٹھ سو صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب کی اشاعت کے تمام مصارف ڈاکٹر عثمانی کے اہل خاندان نے برداشت کئے ہیں اور کتاب میں ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی کا تحریر کردہ ایک مبسوط اور وقیع مقدمہ بھی شامل ہے جس میں تحریک کی پوری تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ وسعت آفاق میں مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی اس ''تکبیر مسلسل'' کی اشاعت اپنی اہمیت و افادیت کے اعتبار سے انتہائی اہم اور قابل مبارکباد کارنامہ ہے۔ جو ملت اپنے اسلاف کی مخلصانہ خدمات اور کارناموں کو زندہ رکھتی ہے، خود اس کے ایک زندہ ملت ہونے میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

☆☆☆☆☆

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

کا سفرنامۂ حج

ذوق وشوق میں ڈوبا ہوا

''اپنے گھر سے بیت اللہ تک''

یہ سفر نامہ صرف روداد سفر نہیں بلکہ حج کے سلسلہ کی ساری معلومات اس میں آگئی ہیں اور قدم قدم پر ایسی رہنمائی ملتی ہے جس کے سہارے حاجی اپنا سفر طے کرتا چلا جاتا ہے۔

اسی کے ساتھ

حج کے چند مشاہدات و احساسات۔ حج کے سلسلہ میں شریعت کے حکیمانہ انتظامات کے عنوان سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین بھی شامل ہیں۔

مزید یہ کہ اس میں

مولانا سید محمد رابع حسنی ناظم ندوۃ العلماء کا مکمل مضمون ''حج کے اقسام طریقے اور آداب'' بھی شامل ہے جس کے پڑھنے کے بعد حاجی کو دوسری کتابوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آخر میں

مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی نظمیں اور گلدستہ حمد وسلام اور مناجات شامل کتاب ہے۔

قیمت -/۲۵ روپے۔ خوبصورت کتابت وطباعت

مولانا محمد ثانی حسنی کا حج نامہ

لبیک اللھم لبیک

قیمت -/۳۰ روپے

(محصول ڈاک علاوہ)

ناشر

مکتبہ اسلام ۲/۵۴ ۔ اے محمد علی لین، گوئن روڈ لکھنؤ

حکمت و دور اندیشی کی ضرورت

مولانا شمس الحق ندوی

دین وملت کی خدمت و پاسبانی کا تعلق محض جسمانی حرکت اور زبانی تقریر و خطابت سے ممکن نہیں ہے، یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے۔ جسم کی حرکت اور زبان کی ہر جنبش اسی وقت مفید و مؤثر ہوتی ہے جب اس میں خلوص پایا جاتا ہو (یعنی مقصود رضائے خداوندی) خلوص نہ ہو تو اچھی سے اچھی تحریر و تقریر کی حیثیت کاغذی پھولوں سے زیادہ نہیں رہ جاتی، وقتی طور پر کچھ ظاہری اثر محسوس ہو یہ تو ممکن ہے لیکن اس سے کوئی تبدیلی آئے، زندگیوں میں انقلاب آئے، دل بدل جائیں، یہ ممکن نہیں، یہ ایک حقیقت ہے (قبول حق کے بارے میں) اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مگر ایک اور بات جو نہایت اہم و ضروری ہے اس کو بہت کم کہا جاتا ہے، وہ ہے خلوص کے ساتھ موقع شناسی، حکمت و بصیرت، نفع و نقصان کا موازنہ اور صحیح سوجھ بوجھ۔ حدیث شریف کے الفاظ (افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر) ''ظالم بادشاہ سے حق بات کہنا سب سے افضل جہاد ہے'' لوگ عام طور پر دہراتے رہتے ہیں، لیکن کلمۂ حق کہنے کا انداز کیا ہونا چاہیئے، جس سے یہ بات کہنی ہے اس کو متاثر کرنے کے لئے پہلے اس کے ذہن کو کس طرح ہموار کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے، اس کی فکر کم ہی لوگ کرتے ہیں، بس کلمہ حق کہہ دینا ہی جہاد اکبر تصور کرتے ہیں اور اپنی اس حق گوئی پر قانع و مطمئن ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ حق گوئی کا یہ طریقہ بسا اوقات مخاطب کو اور دور کردیتا ہے بلکہ اس میں ضد پیدا کردیتا ہے اکثر اس طرز کلام سے نفع کے بجائے نقصان پہنچتا ہے۔

دین اسلام کسی ذہن انسانی کی ایجاد نہیں بلکہ خالق کون ومکان، خالق انس وجن کا دیا ہوا دستور حیات ہے، جس میں باطل کا گذر نہیں، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو نرمی، رحمت و رأفت اور پیار و محبت کے اسلوب و انداز میں اس دین کو پیش کرنے کی ہدایت فرمائی، حکمت، نصیحت کے اچھے انداز اور بحث و مباحثہ کی نوبت آئے تو بہتر و شریفانہ طریقہ پر بحث کی تلقین فرمائی، فرمایا: (اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ) ''آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ بلایئے، اور (اگر بحث آن پڑے تو) ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔''

حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کو فرعون کے پاس بھیجا تو باوجود یکہ وہ خدائی کا دعویدار تھا تاہم اس کو دعوت پیش کرنے میں نرم و میٹھا ہی انداز اپنانے کی ہدایت کی گئی، فرمایا: (اِذْهَبَا اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی، فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی) ''دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہورہا ہے، اور اس سے نرمی سے بات کرنا شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے''۔

ظالم و جابر بلکہ خدائی کے دعویدار سے بھی نرم لہجہ میں بات کرنے کی ہدایت کی جارہی ہے، زیادہ تفصیل میں جائے بغیر ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ یہ خیال کہ حق بات حق ہے اس کو جس انداز میں چاہیں کہیں، درست و برحق ہے۔ صحیح و مفید طرز فکر نہیں، موقع و محل، نفع و نقصان کا اندازہ لگانا ضروری ہے، ورنہ یہ عین ممکن ہے کہ ہم ایک کام ملت کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے کریں لیکن ملت کو فائدہ سے کہیں زیادہ نقصان پہنچ جائے، محض ہمارا مخلص و بے لوث ہونا اس نقصان سے نہ بچاسکے گا کہ ہم نے بصیرت و دور اندیشی اور حکمت و موقع شناسی سے کام نہیں لیا، اخلاص کے لئے فراست مومنانہ بصیرت و موقع شناسی کی پاسبانی کا ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ہم اپنے اخلاص کے زعم میں ایسا قدم بھی اٹھاسکتے ہیں جس سے ملت کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ جائے، ایک خطرہ سے بچنے کے لئے ہم کوئی ایسا غیر دانشمندانہ قدم اٹھادیں جو ملت کے لئے دوسرے بہت سے خطرات پیدا کردے یا خطرات کو طاقت پہنچادے، بہت سے قائدین، داعیوں اور ملت کے بہی خواہوں کے اخلاص میں ذرہ برابر شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کے طریقۂ دعوت یا دین کی حفاظت و دفاع کی غرض سے کسی فتنہ کا دروازہ بند کرنے کے لئے ایسا طریقۂ کار اپنانے پر حیرت ہوتی ہے جس سے فتنہ کا دروازہ بند ہوتا تو مشکل لیکن فتنوں کے دوسرے بہت سے دروازے کھل جانے کا قوی بلکہ یقینی امکان ہوتا ہے۔

حضور ﷺ کی سیرت زندگی کے ہر شعبہ و مرحلہ میں ہماری رہنمائی کرتی ہے، ہمیں اپنے اخلاص کے زعم میں حکمت و دور اندیشی، بصیریت و موقع شناسی کی طرف سے صرف نظر نہ کرنا چاہیئے کہ یہ دین کی روح کے خلاف ہے، سیرت نبویؐ میں اس کے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔

یہ بہت معروف اور عام بات ہے کہ عہد رسالت میں مسلمانوں کی جماعت میں منافقین کی ایک بڑی تعداد تھی جو مسلمانوں کی صفوں میں رہ کر طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کرتی رہتی تھی اور حضور ﷺ اس سے اچھی طرح باخبر تھے لیکن حکمت و مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ ان کے ساتھ کوئی بڑی تنبیہی کارروائی نہ کی جائے جس سے غیر مسلموں کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ یہ نبی تو اپنے ہی لوگوں کو مار دیا کرتے ہیں۔

یہاں عبداللہ بن اُبی کا واقعہ قابل ذکر ہے جو مار آستین بن کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتا تھا، غزوۂ خندق میں کامیابی اور بنو قریظہ کا خاتمہ کردینے کے بعد عبداللہ بن اُبی اس فکر میں تھا کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرے، ایک مرتبہ

مسلمان مقام مریسیع کے پانی سے اپنے ڈول بھر رہے تھے کہ سنان اور جہجاہ نامی دو مسلمانوں میں جھگڑا ہو گیا سنان نے جہجاہ کو ایسا مارا کہ خون نکل آیا، جہجاہ نے بھاگ کر قریش و کنانہ کی دہائی دی اوس و خزرج کے لوگ بھی آگئے اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ مسلمان آپس میں لڑ جائیں لیکن ایک شخص نے سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کیا۔ عبداللہ بن اُبی دس منافقین کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، وہ غصہ سے بھڑک اٹھا اور بڑی اشتعال انگیز باتیں کہیں یہاں تک کہہ دیا کہ مدینہ پہنچ کر ہم ان کو ذلیل کر کے نکال دیں گے۔ حضور ﷺ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے لوگوں کا غصہ ہلکا کرنے کے لئے نرم انداز گفتگو اپنایا مجلس میں حضرت عمرؓ بھی حاضر تھے۔ فرمایا اللہ کے رسول آپ عباد بن بشر کو حکم دیں کہ عبداللہ بن اُبی کو قتل کر دیں۔ لیکن آپ ﷺ کی نگاہوں میں اس انتشار و فتنہ کا نقشہ آگیا جو عبداللہ بن اُبی کے قتل سے پیدا ہوتا اور لوگوں کو سازشوں کا مزید موقع ملتا، آپؐ نے فرمایا نہیں، پھر تو لوگ یہ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں آپؐ نے اتنا ہی نہیں کیا بلکہ فوراً کوچ کا حکم دیا کہ لوگوں کا ذہن دوسری طرف مشغول ہو جائے اور برابر چلتے رہے یہاں تک کہ لوگ تھک کر چور ہو گئے، اور غیظ و غضب سب بھول گئے۔

یہ تھی حکمت نبوت جس میں ہمارے لئے یہ سبق ہے کہ موقع و محل دیکھ کر، سوجھ بوجھ سے کام لے کر کوئی اقدام کریں، مسلمانوں کی صفوں میں گھس کر منافقین کی ریشہ دوانی کتنی خطرناک تھی لیکن ان کے خلاف اقدام سے دوسرے اور بڑے خطرات پیدا ہو سکتے تھے اور اسلام و مسلمانوں پر الزام تراشی اور اسلام کی طرف سے بے اعتمادی پیدا کرنے کا ایک نیا دروازہ کھل سکتا تھا لہٰذا آپؐ نے عبداللہ بن اُبی کے قتل کی اجازت نہیں دی۔

ہم جس دور سے گذر رہے ہیں یہ دور بہت نازک اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے نہایت پُر فریب اور مکاریوں کا دور ہے، اس نازک دور میں ہمارے علماء، داعیوں اور قائدین ملت کو نہایت تیقظ اور حکمت اور دور اندیشی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

اسلام کے خلاف کسی بھی تحریک و خطرہ کو محسوس کر کے اس کے خلاف جوش و جذبہ کا پیدا ہونا غیرت ایمانی کے عین مطابق ہے لیکن چاروں طرف سے آنکھ بند کر کے اس جوش و جذبہ کے تقاضہ پر عمل کرنا دوسرے بہت سے خطروں سے زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے، بہت مشہور مثل ہے (دانا دشمن بہتر از ناداں دوست) بعض وقت ایک خاص دائرہ فکر کے خول میں بند مخلص کا ناعاقبت اندیشانہ اقدام وہ نقصان پہونچا سکتا ہے جو کسی بڑے اور قوی دشمن سے بھی نہیں پہنچ سکتا، اس وقت اسلام و مسلمانوں اور عالم اسلام کو نقصان پہونچانے کے لئے کس ذہانت سے کام لیا جا رہا ہے اس کو سمجھنے کے لئے بڑی باخبری، ذہانت، اور موجود دنیا کے سیاسی نقشہ پر گہری نظر رکھنے اور اس کا جائزہ لیتے رہنے کی ضرورت ہے اسلام کو نقصان پہنچانے والے تو نہایت باریک جال تیار کرتے ہیں کہ خوردبین سے بھی نظر آنا مشکل ہوتا ہے اور اسلام کے محافظ داعیوں اور قائدین کا یہ حال ہے کہ ذہن میں کوئی نقشہ آیا نہیں کہ اس کا ڈنکا بجنا شروع ہو گیا جس کا سب سے پہلا نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ دشمنان اسلام ہوشیار ہو جاتے ہیں اور اسلام کے خلاف سازشوں کا ایک نیا انداز اپنا لیتے ہیں کہ ذہن ادھر جلد منتقل نہ ہو۔

حضور ﷺ کا معمول تھا کہ اپنے مخالف کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے گفتگو فرماتے تھے، ادب و ثقافت سے بات کرتے تھے اس کی صلاحیتوں کی قدر دانی کرتے ہوئے گفتگو فرماتے کہ مخالف کو متاثر کرنے کا یہی کامیاب طریقہ ہے۔

مگر ہمارے بہت سے داعیوں اور قائدین کا حال یہ ہے کہ مخالف سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں کہ اس کی مخالفت کی آگ اور بھڑک جائے اور خود مسلمان بھی مشتعل ہو کر اعتدال و توازن کا راستہ چھوڑ دیں جس کا انجام خود اپنے کو نقصان پہنچائے۔ مزید تفصیل میں جائے بغیر ہم صرف یہ عرض کرنا چاہیں گے۔ ع

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی تاریخ ساز تحریک، گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں کی ناقابلِ فراموش تعلیمی خدمات

ہندوستان میں نظامِ تعلیم کے منفی رجحانات، اسلامی تہذیب اور ملی تشخص کی اہمیت و افادیت سے متعلق ایک تاریخی دستاویز۔

تکبیرِ مُسَلسَل

چالیس برس دینی تعلیمی کونسل کے صدر کی حیثیت سے

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ

کی تقریروں اور تحریروں کا آٹھ سو صفحات پر مشتمل ضخیم اور جامع انتخاب

مقدمہ: مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

پیش لفظ: مولانا عبداللہ عباس ندوی

مُرتبہ

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی

(سکریٹری دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش)

تکبیرِ مُسَلسَل

ایک مردِ مومن کے اعلانِ حق، ایک مجاہد کے نعرۂ حُریت، ایک محبِ وطن کے فکر و خیال سے لبریز ہے۔

ضخامت : ۷۸۴ صفحات

قیمت : ۳۰۰ روپئے

ملنے کے پتے

۱۔ دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش۔ عارف آشیانہ، چوک، لکھنؤ

۲۔ مجلسِ تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۳۔ ندوی بک ڈپو۔ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۴۔ مکتبہ الفرقان۔ نیا گاؤں، نظیر آباد، لکھنؤ

۵۔ مکتبہ اسلام۔ گوئن روڈ، لکھنؤ

۶۔ اسلامی بک ہاؤس۔ امین الدولہ پارک، امین آباد، لکھنؤ

۷۔ مکتبہ حرمین۔ کچہری روڈ، لکھنؤ

۸۔ مکتبہ دین و ادب امین الدولہ پارک امین آباد لکھنؤ

تعلیم و تربیت

نئی نسل ایک امانت ہے

مولانا سراج الدین ندوی

ہر بچہ اپنے لڑکپن اور عنفوان شباب سے گزرتا ہوا زندگی کے رواں دواں قافلے میں شامل ہوتا ہے۔ بچے جوان ہو کر سماج کی مختلف اکائیوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں کوئی امیر ہوتا ہے کوئی غریب، کوئی راجا بنتا ہے کوئی پرجا، کوئی قاتل ہوتا ہے کوئی مقتول، کوئی فسادی بن کر ابھرتا ہے اور کوئی مصلح بن کر۔

ہمارے سماج میں چلتے ہوئے انسان کل ''بچے'' تھے جھگڑالو اور خونی ''جگو'' بھی ایک ''معصوم'' بچہ تھا اور لوگوں کو بھلائی کی تلقین کرنے والا ''فضل حق'' بھی ایک ''چنچل بچہ'' تھا جس بچہ کو ماں باپ اور قریبی ماحول کی اچھی تربیت نصیب ہو گئی وہ سماج کا بہترین انسان بن گیا اور جس بچہ کو نشو و نما کے مراحل میں اچھی تربیت اور رہنمائی نہ مل سکی وہ بے راہ روی کا شکار ہو کر غلط راستے پر چل پڑا۔

ہر قوم اور ملک کے مستقبل کا دارومدار اس کے ہونہار بچوں پر ہے آج کے بچے کل کے معمار یا تخریب کار ہیں بچوں کو نظر انداز کر کے نہ کوئی قوم کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ کوئی ملک۔ ہر دور میں بچوں کی اہمیت کو کسی نہ کسی درجہ میں ضرور تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے آغاز سے بچوں پر خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ بچوں کے رجحانات و جذبات ان کی نفسیات کے مطالعہ و تجزیہ کو ایک موضوع کی حیثیت دے کر اس پر قابل قدر کام ہوا ہے۔

اس حیثیت سے تو بچوں کی اہمیت ہے ہی کہ وہی بڑے ہو کر سماج کے مختلف عناصر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں لیکن اس حیثیت سے بھی بچوں کو کم اہمیت حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے بچپن میں بھی اپنی صلاحیتوں سے ملک و ملت کو مستفید کرتے ہیں۔ اگر بزرگوں کی فہم و فراست، صبر و تحمل زیرکی و تجربہ کاری، نوجوانوں کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون، ان کا جوش و ولولہ، ملک و ملت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتا ہے تو بچوں کی معصوم ادائیں، ان کی ننھی منی کلائیاں، انکے پرسوز نغمے جذبہ جہاد کی روح کو پیدا کرتے ہیں اور ملت کے افراد کے اندر حوصلہ و امنگ پیدا کرتے ہیں۔

اب سے چودہ سو سال پہلے کی تاریخ پر نظر ڈالئے۔ جب اسلام اپنے ابتدائی دشوار گزار مراحل سے گزر رہا تھا اسلام کا پیغام قریب ترین لوگوں تک پہنچانے کے لئے رسول خداؐ اپنے اہل خاندان کو کھانے پر مدعو کرتے ہیں فراغت کے بعد آپ ان کے سامنے خدا کا پیغام پیش کرتے ہیں۔ انہیں بت پرستی ترک کر دینے اور الٰہ واحد کی عبادت کی تلقین کرتے اور عذاب آخرت سے ڈراتے ہیں اور فرماتے ہیں ''کون ہے جو اس کانٹوں بھری راہ میں میرا ساتھ دے گا'' خاندان کے تمام لوگ خاموش بیٹھے ہیں گویا انہیں سانپ سونگھ گیا ہے۔ ایک گوشہ سے دھیمی سی آواز سنائی دیتی ہے ''اگرچہ میں بیمار ہوں، میری آنکھیں آئی ہوئی ہیں، میری ٹانگیں پتلی ہیں اور میری عمر بہت کم ہے لیکن اے رسول خداؐ میں ہر حال میں آپ کا ساتھ دوں گا'' یہ آواز کس کی تھی؟ کس عمر رسیدہ کی تھی؟ کس جوان کی تھی؟ نہیں بلکہ ایک بچہ کی تھی جس کی عمر مشکل سے دس گیارہ سال تھی۔ اس بچہ نے خدا اور رسول کا ساتھ دینے کا عہد اس وقت کیا جب تمام سرداران قریش خاموش رہے اس بچہ کو اسلامی تاریخ حضرت علیؓ کے نام سے جانتی ہے، جنہوں نے زندگی بھر اپنے عہد کو نبھایا۔ ہر نازک موقع پر اسلام کی خاطر اپنی جان پر کھیلے اور اسلامی ریاست کے چوتھے خلیفہ ہوئے۔

غزوۂ بدر کی تیاریاں ہو رہی ہیں مکہ کے مشرکوں نے مدینہ پر حملہ کی ٹھان رکھی ہے۔ پیارے نبی ﷺ اپنے دفاع کے لئے اسلامی لشکر لے کر بدر کی طرف بڑھ رہے ہیں تاکہ مدینہ پر حملہ کرنے والوں کو پسپا کر دیں۔ اسلام کے جانباز سپاہی جوش و ولولہ کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ گیارہ بارہ سال کا ایک بچہ عمیرؓ چھپ کر پیچھے پیچھے چل رہا ہے بھائی کی نظر پڑتی ہے تو پوچھتے ہیں کہ ''تم کیوں چھپ کر چل رہے ہو'' بچہ جواب دیتا ہے ''مجھے ڈر ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو وہ کم عمری کی بنا پر مجھے واپس کر دیں گے اور شرکت کی اجازت نہ دیں گے جب کہ میں اللہ کی راہ میں لڑنا چاہتا ہوں'' چھوٹے بھائی کے جذبات کو دیکھ کر بڑے بھائی کو مسرت ہوئی۔

اچانک حضور ﷺ کی نظر عمیرؓ پر پڑتی ہے۔ آپ دیکھتے ہی اسے واپسی کا حکم دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اے بچے! تم واپس جاؤ جب بڑے ہو جاؤ گے تو آنا، جنگ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ تو بڑوں کے لئے بھی نہایت مشکل ہے یہ سن کر عمیرؓ غم کی تصویر بن جاتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں یہ دیکھ کر حضور اکرم ﷺ کا دل بھر آتا ہے آپ کی آنکھوں میں آنسو تارے بن کر چمکنے لگتے ہیں

اور اس بچہ کو شرکت کی اجازت مرحمت فرما دیتے ہیں یہ نو عمر بچہ بڑی جاں بازی سے لڑتا ہے اور جام شہادت نوش کر لیتا ہے۔

غزوۂ بدر کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں رسول خدا ﷺ اسلامی لشکر کی صف بندی کر رہے ہیں سامنے کفار کا آہنی لشکر کھڑا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے دائیں بائیں دو سگے بھائی کھڑے ہیں جن کا شمار ابھی بچوں میں ہوتا ہے جب معرکہ آرائی شروع ہوتی ہے تو ایک بھائی چپکے سے حضرت عبدالرحمٰن سے پوچھتا ہے کہ مجھے بتایئے ابوجہل کون ہے؟ دوسرا بھائی چپکے سے پوچھتا ہے کہ چچا جان! ابوجہل کہاں ہے؟ حضرت عبدالرحمٰن ابوجہل کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں یہ دونوں بچے صفیں چیرتے ہوئے ایک دوسرے سے پہلے ابوجہل کا کام تمام کر دینا چاہتے ہیں، دونوں بچوں کی حملہ کی تاب نہ لا کر لشکر کفار کا سردار زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ دونوں دوڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس پہنچتے ہیں اور ابوجہل کے قتل کی خوشخبری سناتے ہیں۔ شوق جہاد میں دونوں بچے اس عظیم کارنامہ کو اپنی اپنی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ تلوار کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دونوں کی تلواریں خون میں لت پت ہیں دونوں بچوں کو شاباشی دیتے اور ان کے حق میں کلمات خیر کہتے ہیں۔

ایک سال بعد مشرکین دوبارہ مدینہ پر یلغار کرتے ہیں۔ حضور اکرمؐ اپنے ساتھیوں کو لے کر ان کے مقابلہ کے لئے نکلتے ہیں، جہاد میں شرکت کے لئے دو بچے بھی خوشی خوشی جا رہے ہیں آپؐ انہیں دیکھتے ہی واپسی کا حکم دیدیتے ہیں ان میں ایک بچہ رافع بن خدیج ایڑیوں کے بل کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے "اے اللہ کے رسولؐ! میں تو بڑا ہوں" پیارے نبیؐ کو اس کی اس ادا پر پیار آ جاتا ہے اور آپؐ اسے جہاد میں شرکت کی اجازت دیدیتے ہیں تبھی ایک دوسرا بچہ سمرہ بن جندب دوڑ آتا ہے اور کہتا ہے "اے اللہ کے رسول اگر آپؐ نے رافع کو جنگ میں شرکت کی اجازت دی ہے تو مجھے بھی اجازت عنایت کر دیجئے میں اس سے بھی زیادہ طاقت ور ہوں میں اس کو کشتی میں بھی پچھاڑ دیتا ہوں" پیارے نبیؐ دونوں کی کشتی کراتے ہیں واقعی سمرہ رافع کو پچھاڑ دیتے ہیں اور اللہ کے رسولؐ سمرہ کو بھی شرکت کی اجازت مرحمت فرما دیتے ہیں۔

یہ حضرت مصعب بن عمیرؓ ہیں جو ابھی نوجوانوں میں شمار کئے جاتے ہیں نہایت عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مشہور ہے کہ جس لباس پر مکھی بیٹھ جاتی ہے اسے دوبارہ نہیں پہنتے جس گلی سے گزر جاتے ہیں وہ گلی معطر ہو جاتی ہے گھر پر سامان عیش و آرائش کی فراوانی ہے۔

ایک سرمایہ دار گھرانے کا پروردہ نونہال جب اسلام قبول کرتا ہے تو اس کی عیش و عشرت کی زندگی اس سے چھین لی جاتی ہے اسے مصیبت و تنگی کی چکی میں پیسا جاتا ہے لیکن اسلام کا یہ عاشق فقر و فاقہ کو ترجیح دیتا ہے اور اسلام کے لئے ہر وقت ہر آزمائش کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اللہ کے راستہ میں شہید ہوتا ہے تو اس کے پاس کفن کے لئے کپڑا بھی نہیں۔ استعمال میں آنے والی ایک چھوٹی سی چادر ہے چھوٹی بھی اتنی کہ سر ڈھانپتے ہیں تو پیر خالی رہ جاتے ہیں اور پیر ڈھانپتے ہیں تو سر خالی رہ جاتا ہے یہ دیکھ کر پیارے نبیؐ اور صحابہ کرامؓ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ سر ڈھانپ دیا جائے اور پیروں پر گھاس رکھ دی جائے۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ جس نے اسلامی تاریخ پر اپنی عظمت و شوکت کے نقوش ثبت کئے ہیں ابھی نوعمر ہی ہیں۔ عیسائی فوجیں "رُہا" پر قبضہ کر کے مال و اسباب لوٹ لیتی اور عورتوں کو پکڑ لے جاتی ہیں یہ ظلم دیکھ کر یہ نوعمر صلاح الدینؒ ایک بوڑھے کو لے کر سلطان عماد الدین زنگیؒ کے پاس پہنچتے ہیں عیسائیوں کے مظالم سے بادشاہ کو آگاہ کرتے ہیں اس کی اسلامی حمیت و غیرت کو بیدار کرتے ہیں اور رُو رُو کر فریاد کرتے ہیں۔

نیک دل بادشاہ زنگیؒ کو ان حالات کا علم ہوتا ہے وہ تمام فوجیوں کو جمع کرتا ہے انہیں "رُہا" کے حالات سناتا اور جہاد پر ابھارتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ کل صبح میری تلوار رہا کہ قلعہ پر لہرائے گی۔ تم میں سے میرا کون ساتھ دے گا؟ یہ اعلان سن کر تمام فوجی حیران رہ جاتے ہیں کہ یہاں سے "رُہا" ۹۰ میل کی دُوری پر ہے راتوں رات وہاں کیسے پہنچا جا سکتا ہے یہ تو کسی طرح ممکن نہیں، تمام فوجی ابھی غور کر ہی رہے تھے کہ ایک نوعمر لڑکے کی آواز گونجتی ہے "ہم بادشاہ کا ساتھ دیں گے"۔

لوگوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو نوعمر لڑکا کھڑا تھا بعضوں نے فقرے چست کئے "جاؤ میاں کھیلو کودو! یہ جنگ ہے بچوں کا کھیل نہیں ہے، تمہیں ہمارے بیچ بولنے سے کیا مطلب؟"

سلطان زنگیؒ نے یہ فقرے سنے تو غصہ سے چہرہ سرخ ہو گیا بولا، "یہ بچہ سچ کہتا ہے اس کی صورت بتاتی ہے کہ یہ کل میرا ساتھ دے گا۔ یہی وہ بچہ ہے جو رُہا سے میرے پاس فریاد لے کر آیا ہے اس کا نام صلاح الدین ہے"۔

یہ سن کر فوجیوں کو غیرت آتی ہے سب تیار ہو جاتے ہیں اور اگلے روز دوپہر تک رہا پہونچ کر دھاوا بول دیتے ہیں گھمسان کی

جنگ ہوتی ہے عیسائی سپہ سالار لوہے میں غرق آن و بان کے ساتھ مقابلہ کے لئے نکلتا ہے سلطان زنگیؒ اس پر کاری ضرب لگاتا ہے مگر لوہے کی زرہ وار کو بے اثر بنا دیتی ہے عیسائی سپہ سالار پلٹ کر سلطان زنگیؒ پر حملہ کرتا ہے نیزہ تان کر سلطان کی طرف پھینکنا چاہتا ہی ہے کہ صلاح الدین کی تلوار فضا میں بجلی کی طرح چمکتی ہے اور زرہ کے کٹے ہوئے حصہ پر گر کر عیسائی سپہ سالار کے دو ٹکڑے کر دیتی ہے۔

سپہ سالار کے قتل ہوتے ہی عیسائی فوج بھاگ کھڑی ہوتی ہے رہا پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔

ہر شخص کی زبان پر نوعمر صلاح الدینؒ کی شجاعت و جرأت کے چرچے ہیں اور یہ واقعہ تاریخ اسلامی میں سنہرے الفاظ سے لکھا جاتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ بچوں اور نوعمروں نے ہمیشہ اہم رول ادا کیا ہے برائیوں سے لڑنے اور بھلائیوں کے پروان چڑھانے کا جذبہ اگر بچوں میں پیدا کر دیا جائے تو وہ نوعمری میں بھی اور بڑے ہو کر بھی ناقابل فراموش کارنامے انجام دیتے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاںؒ طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ بچے جو نیک تمنائیں کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو بچوں کی معصومیت پر اتنا ترس آتا ہے کہ ان کی تمنائیں ضرور پوری کرتا ہے چنانچہ یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ بچہ اپنے بچپن میں اپنے مستقبل کے لئے جو تمنا کرتا ہے عموماً مستقبل میں اسکی تمنا پوری ہوتی ہے بہر حال بچپن اور لڑکپن کی عمر مختلف پہلوؤں سے بہت ہی اہم ہے۔

☆☆☆☆☆

غزل

یہ لالہ و گل، یہ صحن و روش ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریب جنوں کے پردے میں تعمیر گلستاں ہوتے ہیں

بیدار عزائم ہوتے ہیں اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں

باطل کی ہو کتنی ہی طاقت، باطل کی اطاعت کیا معنی
ایماں پہ فدا ہو جاتے ہیں جو صاحبِ ایماں ہوتے ہیں

آسودۂ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل پہ بھی موجیں اٹھتی ہیں خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

یہ خون ہے جو مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرف بہاراں ہوتے ہیں

جانبازِ محبت جو ہیں جگرؔ مرنے سے نہیں ڈرتے ہرگز
جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

حضرت جگرؔ مراد آبادی

گوشۂ خواتین

شوہر کے حقوق اور ان کی اہمیت

محمد عبدالرشید ندوی

موجودہ دور میں ریڈیو، ٹی وی، ویڈیو، ڈش انٹینا اور فلموں کی وجہ سے معاشرہ کے اندر بڑی توڑ پھوڑ ہورہی ہے اور بڑی خرابیاں پیدا ہورہی ہیں، ان خرابیوں میں ایک بڑی خرابی بیوی کا شوہر کی نافرمانی کرنا، اس کے ساتھ زبان درازی کرنا، اس کے حقوق پوری طرح ادا نہ کرنا، شوہر کی ناراضگی کو قابل اعتناء نہ سمجھنا ہے، آئے دن نئی نئی فرمائش کرنا، شوہر کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا، مرضی پر نہ چلے تو اسے مختلف طریقوں سے تنگ کرنا، خود اچھے سے اچھا کھالینا اور شوہر کے کھانے کا کوئی اہتمام نہ کرنا، بچوں کے لئے اچھے سے اچھے کپڑے اور کھانے پینے کیلئے لڑنا، اور شوہر کے کھانے پینے اور کپڑوں کی کوئی فکر نہ کرنا، شوہر کچھ کہے تو اس پر گھر کے کاموں اور بچوں کی دیکھ بھال اور بچوں کی وجہ سے رات میں بار بار جاگنے کا احسان جتانا، اور یہ طعنہ دینا کہ تم ایک دن گھر اور بچوں کو سنبھال کے دکھاؤ تو پتہ چلے۔

یہ اور اسی طرح کی باتیں عموماً عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے یہاں تک کے شوہر کا گھر میں جی نہیں لگتا اور وہ اپنے لئے باہر ہی کوئی پناہ گاہ تلاش کرلیتا ہے، یا اپنا زیادہ وقت دوستوں اور رشتہ داروں میں گذارتا ہے، آج کل اکثر گھرانوں میں عورت عملی طور پر حاکم بن چکی ہے اور مرد محکوم ہے، گھر میں شوہر جو چاہے وہ نہیں ہوتا، بیوی جو چاہے وہی ہوتا ہے، نتیجۃً گھر کا سارا نظام اور سکون درہم برہم ہوجاتا ہے، اگر معاملہ زیادہ بگڑے تو عموماً طلاق پر یا دوسری شادی پر منتج ہوتا ہے، پہلی شکل میں بیوی اور بچوں کی زندگی برباد ہوتی ہے، اور دوسری شکل میں بیوی کی زندگی تلخ ہوجاتی ہے، اور گھر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی، ایسی عورت سوائے کف افسوس ملنے کے کچھ نہیں کرسکتی، ان ہی حالات کے پیش نظر جواب بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں دیکھنے اور سننے کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام نے بیویوں پر شوہر کے جو حقوق عائد کئے ہیں ان کو واضح کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ شوہر کے حقوق پورا نہ کرنے پر بیوی کا دنیا وآخرت میں کیا نقصان ہے شاید اسے پڑھ کر بعض عورتوں کو عقل آجائے، اور ان کا گھر تباہی وبربادی سے بچ جائے۔ اگر کوئی عورت درج ذیل حدیثوں پر ایک بار اچھی طرح غور کرلے تو اس کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ عورت کا جو وقت شوہر کی ناراضگی کے دوران گذرتا ہے وہ اس کے لئے دنیاوی اور اخروی دونوں اعتبار سے ایک وبال اور مصیبت ہے۔

☆ بعض عورتیں شوہر کی ناراضگی کو کوئی اہمیت نہیں دیتیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم یہ غور کرو کہ تمہارا معاملہ شوہر کے ساتھ کیسا ہے؟ کیونکہ وہی تمہاری جنت ہے اور وہی تمہاری دوزخ ہے۔ گویا جنت میں داخل ہونے کے لئے شوہر کی رضامندی اور اس کا خوش ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر جنت میں داخلہ ممکن نہیں۔

☆ جس عورت کا انتقال اس کے شوہر کی رضامندی کی حالت میں ہو وہ جنت میں جائے گی۔ ارشاد نبویؐ ہے کہ جس عورت کا انتقال اس حال میں ہو کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہو تو وہ جنت میں جائے گی۔"

☆ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس عورت کی نماز پیش نہیں کی جاتی جس عورت سے اس کا شوہر خفا ہو، قبول ہونا تو دور کی بات ہے، ارشاد نبوی ہے کہ دو طرح کے لوگوں کی نمازیں ان کے سروں سے اوپر نہیں جاتیں، ایک بھاگا ہوا غلام جب تک اپنے مالک کے پاس واپس نہ آجائے، دوسرے وہ عورت جو اپنے شوہر کی نافرمانی کرے یہاں تک کہ اس کی اطاعت نہ کرنے لگے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے شوہر کے علاوہ کسی اور کے حق کو اپنے حق کے برابر نہیں رکھا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے عورت اپنے رب کا حق اس وقت تک ادا نہیں کرسکتی جب تک اپنے شوہر کا پورا حق نہ ادا کرے۔

☆ اسلام نے شوہر کے حقوق کو اتنی اہمیت دی ہے کہ عورت کے جنت میں داخلہ کے لئے جو چار شرطیں رکھی ہیں ان میں دو شرطیں اللہ تعالیٰ سے متعلق ہیں اور دو شرطیں شوہر کے متعلق ہیں، ارشاد نبوی ہے کہ جس عورت نے پانچ وقت کی نماز پڑھی اور (رمضان کے مہینہ کا) روزہ رکھا، اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی اور اپنے شوہر کی اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگی۔

☆ اللہ تعالیٰ صرف شوہر کی خاطر اس کی بیوی کے نفلی روزے کے حق سے دستبردار ہوجاتا ہے، ارشاد نبوی ہے کہ کسی بیوی کے لئے جائز نہیں کہ اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر (نفلی) روزہ رکھے۔

☆ اسلام نے عورت کو "ماں کے قدموں تلے جنت" ہونے کا جو سب سے بڑا اعزاز بخشا ہے، اس بلند اور عظیم اعزاز کو عورت شوہر کی مدد کے بغیر حاصل کر ہی نہیں سکتی، شوہر ہی بیوی کو ماں بنا کر اس عظیم اعزاز کا مستحق بناتا ہے۔

☆ شوہروں کی نافرمانی اور ناشکری کی وجہ سے بہت سی عورتیں جہنم میں جائیں گی، خاص طور سے بیوی کا شوہر کو یہ طعنہ دینا کہ جب سے میں تمہارے گھر آئی ہوں میں نے کبھی بھلائی نہیں دیکھی، حضورؐ کا ارشاد ہے "اے عورتو! کچھ نہ کچھ صدقہ کرتی رہا کرو، خواہ اپنے زیور ہی میں سے کیوں نہ دو، کیونکہ جہنم میں مجھے عورتیں (مردوں سے) زیادہ دکھائی گئی ہیں"، عورتوں نے عرض کیا، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا عورتیں شوہر کی ناشکری اور نافرمانی کرتی ہیں، اگر عورت شوہر کی طرف سے کبھی کوئی برائی دیکھ لے تو کہتی ہے کہ "میں نے تمہارے گھر میں کبھی کوئی بھلائی نہیں دیکھی"

☆ ایک اچھی بیوی کی پہچان کیا ہے یہ بھی حضورؐ کی زبانی سن لیں آپ کا ارشاد ہے کہ اچھی بیوی وہ ہے، جس کو تم دیکھو تو خوش ہوجاؤ اور جب تم اس کو کوئی حکم دو تو وہ اس کی تعمیل کرے، اور تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے مال اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے۔

☆ عورتوں کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ شوہر کی خفگی کی حالت میں ان کی نمازوں کا قبول نہ ہونا، اللہ تعالیٰ کا شوہر کی خفگی دور ہونے تک عورت سے خفا رہنا، اور فرشتوں کا ان پر لعنت بھیجنا، کتنی بڑی سزا ہے؟

☆☆☆☆☆

پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی کا سانحۂ وفات

لکھنؤ ۲۰ر جنوری: دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ واساتذہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر اورڈین ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا، ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تمام دفاتر بند کردئے گئے۔

مرحوم سید ضیاء الحسن ندوی کا وطن پرشدے پور (رائے بریلی) تھا، لیکن ان کا پورا خاندان لکھنؤ میں رہتا تھا، مرحوم نے اپنی تعلیم کے تمام مراحل دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہی پورے کئے، بعد میں انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے، ایم۔اے اور ڈاکٹریٹ کیا، وہ عرصہ سے جامعہ ملیہ دہلی میں تدریس کے شعبہ سے وابستہ تھے، ان دنوں جامعہ ملیہ کے ڈین (آرٹ فیکلٹی) تھے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنے عزیز ومحبوب شاگرد سید ضیاء الحسن ندوی کے اچانک وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی موت ہمارے لئے ذاتی طور پر بڑا صدمہ ہے، وہ صحیح معنوں میں جدید وقدیم کے جامع اور ندوہ کے ترجمان اور نمائندے تھے، اردو تو ان کی مادری زبان تھی، عربی اور انگریزی بولنے اور لکھنے پر ان کو بڑی قدرت تھی ہم سب کے وہ بڑے معتمد اور محبوب تھے، گذشتہ سال انھیں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کا رکن منتخب کیا گیا تھا، وہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے رکن کے علاوہ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے سرگرم ممبر اور اس کے ترجمان "کاروان ادب" کی مجلس ادارت کے رکن تھے، وہ بڑی پابندی سے ملک وبیرون ملک منعقد ہونے والے رابطہ کے اجلاس اور ادبی سمیناروں میں شرکت کرتے تھے، ندوۃ العلماء کے ایسے مخلص اور سرگرم فرزند کا انتقال ہم سب کے لئے بڑا خسارہ ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم مولانا سعید الرحمٰن اعظمی نے پروفیسر ضیاء الحسن کے انتقال پر صدمے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم کو ہم سب سے بڑا گہرا اور مخلصانہ تعلق تھا، ان کی اچانک وفات ہم سب کے لئے بڑا خسارہ ہے، کلیۃ اللغۃ العربیہ کے عمید (پرنسپل) مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کو پروفیسر ضیاء الحسن کے انتقال کی اطلاع ملی تو انھیں بہت دکھ ہوا، مولانا نے بتایا کہ وہ نہ صرف ہم سے ذاتی تعلق رکھتے تھے بلکہ ہمارے پورے خاندان خصوصاً ندوۃ العلماء سے ان کا گہرا مخلصانہ تعلق تھا، ندوہ کا جو بھی پروگرام ہوتا اس میں مرحوم بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے۔

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام اور جمعیۃ الاصلاح میں بھی تعزیتی جلسے منعقد کرکے مرحوم کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا اور پسماندگان خصوصاً ان کے بڑے بھائی اور دارالعلوم کے سابق استاذ مولانا سید محمود الحسن ندوی سے خاص طور پر تعزیت کی گئی، مولانا نذر الحفیظ ندوی اور مولانا شمس الحق نے بھی اس اچانک سانحہ پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کیا۔ اور مرحوم کے انتقال کو خاندانی حادثے سے تعبیر کیا اور کہا کہ ان کے انتقال سے ہم ایک مشفق بھائی سے محروم ہوگئے۔

مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین لڑکے اور ایک لڑکی ہے، یہ چاروں ابھی زیر تعلیم ہیں۔

رب کریم مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کے حسنات کو قبول فرمائے، ان کے ساتھ عفو ودرگزر اور رحم وکرم کا معاملہ فرمائے، انہیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔ اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

یادِ یارِ مہرباں

مولانا سیّد ابوبکر حسنی آغوشِ رحمتِ پروردگار میں

حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی

شوال ۱۴۲۳ھ کی دسویں تاریخ کو اطلاع ملی کہ مولانا سید ابوبکر حسنی کا ان کے وطن تکیہ رائے بریلی میں انتقال ہوگیا۔ زندگی کے آخری ایام بڑے سخت گذرے، جب روح نکلنے کے لئے بے چین تھی اور جسم مقاومت پر آمادہ۔ آخر میں چارپائی سے لگ گئے تھے، پھر وہ وقت آیا جب دیکھنے والوں نے کہا۔ رات تو بستر سے بھی اُٹھنے کی تمہیں طاقت نہ تھی صبح کو دنیا سے اُٹھ جانے کی طاقت آ گئی

مرحوم تکیہ رائے بریلی کے ایک بزرگ خاندان کے فرد تھے۔ دینی وعصری ثقافت کے جامع، انتہائی خوش اخلاق، خوش اطوار، خوش مزاج، ہمیشہ خندہ جبیں دیکھے گئے۔ اپنے خاندان میں بلند قامت تھے، گورا رنگ تھا، بلند بینی، فراخ چشم، جامہ زیب۔ جوانی میں مردانہ حسن سے بہرہ مند تھے اور بڑھاپے میں بھی آنکھیں چمکتی اور چہرہ دمکتا تھا۔

اپنے چھوٹوں کی دلدہی کرنے والے، اپنے خاندان (حسنی) کے عقیدت مندوں سے برابری کا معاملہ فرماتے، اور ان کی دلجوئی فرماتے، کسی مجہول نیاز مند کی تحریر بھی دیکھتے تو دل کھول کر داد دیتے، تحسین کے کلمات سے اس کی ہمت بڑھاتے: ''ارے واہ'' کی تکرار سن کر اس نیاز مند کا سر شرم سے جھک جاتا اور اس کی خواہش ہوتی کہ آئندہ اگر اس کے قلم سے کچھ نکلے تو خواہ کوئی پڑھے یا نہ پڑھے سید ابوبکر حسنی صاحبؒ ضرور اس کی تحریر پڑھ لیں۔

مولانا سید ابوبکر حسنی علیہ الرحمۃ کو ہم 'سید صاحب' کے رمزی لقب سے یاد کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر صدق وصفا کی ایک تابناک تصویر سامنے آجایا کرتی تھی، ان سے مناسبت و عقیدت کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ میرے مخدوم و مربی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے بہت ہی قریب رشتہ کے بھائی تھے اور ہم عمر تھے، ایک دوسرے کو صیغۂ واحد (تم) سے مخاطب کرتے۔ میرے علم میں یہ آخری بزرگ تھے جو حضرت مولانا سے اس درجہ بے تکلف تھے دونوں ایک خاندان کے فرزند۔۔۔۔ ایک مٹی سے اٹھے اور اسی مٹی میں پنپے، ایک مسجد کے نمازی، ایک میدان کے کھلاڑی اور ایک ہی ندی سی کے نہائے ہوئے اور اس میں پیراکی سیکھے ہوئے تھے۔

سید صاحبؒ کا ادبی ذوق ان کے گھرانے کا ورثہ تھا، اُردو تو ان کے یہاں پلی بڑھی، عربی سیکھی تھی اور اچھی سیکھی تھی، انگریزی فرفر بولتے تھے، ندوہ میں عربی پڑھی تھی، اور خاندان میں اس کا چرچہ ہر گھر میں تھا۔ اپنی ایک وہبی صلاحیت سے تفریحی کام انہوں نے لیا تھا۔ انگریزی لب ولہجہ میں بہت تیزی کے ساتھ تقریر کرتے، جس کا ایک لفظ بھی کوئی نہ سمجھ سکتا اور نہ سمجھانا مقصود تھا، الفاظ کے مرغولے، صوتی آہنگ، ہاتھوں کے اشارے، چہرہ پر سرخی کا دوڑ جانا، یہ سب اس طرح ہوتا جیسے بڑے جوش میں کچھ کہہ رہے ہوں، حالانکہ کچھ نہیں کہتے، لکھنؤ میں انگریزوں کے زمانہ میں ایک گورنر کی الوداعی پارٹی تھی، کسی نے شکریہ ادا کرنے کے لئے ان کو بڑھا دیا، جتنے انگریزی داں تھے سب دم بخود۔ چپ اور حیرت زدہ گورنر اور اس کی عورت (لیڈی) کو بتایا گیا کہ یہ ایک ہیومر ہے تو کرسی سے اچھل اچھل کر داد دیتی اور (some more) کچھ اور فرمانے کی درخواست کرتی، کسی ٹرین پر ریلوے گارڈ وغیرہ سے اسی زبان میں گفتگو کرتے تو وہ یس سر یس سر کہتا اتنی ہمت نہیں پڑی کہ I beg your parden کہے۔ ایک مرتبہ ہاسپٹل میں داخل تھے، ایک نرس نے صفائی میں دیر کردی، اس کو اس زبان میں ڈانٹا کہ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

ہمیں ایک تفریحی پہلو سے سابقہ پڑا تھا۔ بہت اصرار پر اس کے نمونے ہم جیسوں کو بھی سنا دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کردار کی بلندی، سیرت کی پختگی میں اور حیا اور مروت میں سادات کی خوبو ہمیشہ محسوس ہوتی تھی۔ اعلیٰ درجے کے مہمان نواز تھے، شخصیت دلنواز تھی، اخلاق وکرم خدا ساز تھا، خدا ترسی ان کے مزاج کا عنصر تھا۔

سید صاحب نے کانپور حلیم کالج میں پڑھایا، دہلی یونیورسٹی میں اُردو عربی پڑھاتے تھے، ان کے شاگرد ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب تھے، کبھی کسی کو ان کی مذہبی تقالید سے شکوہ نہیں ہوا، خوبصورت شرعی داڑھی، ٹخنے سے اونچا پائجامہ، نیچی شیروانی ہمیشہ زیب تن رہی، سید ابوبکر نے لکھنؤ کے شیعہ کالج میں گریجویشن کیا، اور لکھنؤ یونیورسٹی میں جہاں کبھی محترم کی پرورش ہوئی تھی، اسلامی آئین واخلاق پر تقریریں کیں، کچھ ایک لفظ کسی کے خلاف نہیں بولے، نہ کسی کی تضحیک کی اور نہ غیبت کا ارتکاب کیا، مخدوم ومربی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ان کے بھائی

تھے، دونوں کے درمیان احترام متبادل اور حُبّ متبادل کا رشتہ آخری سانس تک قائم رہا، اللہ کی رحمت سے توقع ہے کہ دارِ آخرت میں بھی علیٰ سُرُرٍ متقابلین ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

مولانا شہباز اصلاحیؒ کی وفات

مولانا شہباز صاحب علیہ الرحمۃ و الرضوان دارالعلوم ندوہ کے ایک سینئر مدرس تھے۔ ان سے میری یاداللہ اس وقت سے ہوئی جب میں اُم القریٰ یونیورسٹی سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ہر سال چند ماہ ندوہ میں گزارنے لگا، اور اساتذۂ کرام کے لئے جو کوارٹرس بنے ہیں، اسی کے ایک کوارٹر میں رہنے لگا، مولانائے مرحوم بھی اسی عمارت میں مقیم تھے، اس طرح میں ان کا ایک پڑوسی تھا، تعلقات دوستانہ تھے جو ان کے اخلاق سے عزیزانہ معلوم ہوتے تھے، ان کو بولتے کم دیکھا، طلبہ ان کے گرویدہ تھے، ندوہ آنے سے پہلے وہ بھٹکل میں پڑھا چکے تھے، جس کی تفصیل تعمیر حیات کے اڈیٹر جناب امین الدین شجاع الدین نے اپنے تعزیتی مضمون میں بیان کی ہے۔

مولانا کا تعلق جماعتِ اسلامی سے تھا، یہ تعلق ختم ہوگیا یا مضمحل ہوگیا، مجھے معلوم نہیں، لیکن اتنا دیکھا کہ وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت قریب تھے، پورا رمضان تکیہ رائے بریلی میں گزارتے۔ اور شام کی نشست جو مہمان خانہ کے صحن میں ہوا کرتی اس میں حضرت مولاناؒ کی موجودگی میں پابندی سے بیٹھتے اور جب دوسرے حضرات، اساتذہ، اور شہر کے لوگ چلے جاتے اور مجلس میں حضرت کے علاوہ کوئی نہیں رہ جاتا اس وقت مولانا شہباز صاحب مغرب کی نماز تک جب تک حضرتؒ تشریف فرما رہتے، مولانا بھی موجود رہتے، مگر کبھی نہ بولتے اور نہ کوئی سوال کرتے کوئی بات کرتا تو خوش اسلوبی سے جواب دیتے۔

جیسا کہ امین الدین شجاع الدین نے لکھا ہے کہ 'کنوئیں کی منڈیر' عرصہ تک ان کی نشست گاہ رہی اور وہ اتنے عرصہ تک پابندی سے وہاں بیٹھے کہ جب وہ کنواں توڑ کر سڑک میں داخل کیا گیا تو ہر ایک نے محسوس کیا کہ مولانا شہباز صاحب کی نشست کا کیا ہوگا، مولوی فضل الباری صاحب اور رئیس علی صاحب سے میں نے کہا کہ اس کا بدل سوچئے۔ انھوں نے دارالاقاموں کے بڑے گیٹ سے پہلے سلیمانیہ ہوسٹل سے ملا کر ایک کمرہ اور سائبان بنا دیا تھا، مگر یہ جگہ مولانا کو پسند نہیں آئی، کنویں کے منڈیر کی بات ہی اور تھی۔ چاروں طرف سے کھلی ہوا، روشنی، آزادی و بے تکلفی، تواضع وخاکساری، دکھاوے اور نمائش سے بے پروائی کا منظر سامنے رہتا تھا۔

مولانا کو دس پندرہ سال پہلے پوریسی کی بیماری لگ گئی تھی، اس سے اللہ نے شفا دی، اور وہ ہاتھ میں موٹی چھڑی لے کر چلنے لگے اور پنج وقتہ مسجد میں حاضری دیتے۔ اور بیٹھ کر فرض ادا کرتے۔ مگر مسجد کسی حال میں نہیں چھوڑتے، لاّ یہ کہ آخری مرض جو مرض الموت تھا اور پلنگ سے اٹھنا دشوار ہوگیا۔

ان کے صاحبزادے مولوی صہیب ندوی دبئی میں برسرِ روزگار ہیں۔ الحمدللہ خوش اخلاق، دیندار اور ستودہ صفات ہیں اکرمہ اللہ وسلمہٗ۔

اللہ تعالیٰ مولانا شہباز صاحبؒ کی مغفرت فرمائے اور صالحین کے زمرے میں قیامت کے روز اٹھائے۔ اور پس ماندگان کو دنیا میں نگہبانی اور آخرت میں سرخرو رکھے۔

❁❁❁❁❁

کاروانِ رفتگاں

☆ ۲۹ر شوال ۱۴۲۳ھ کو جناب مولانا حبیب اللہ صاحب پالن پوری سابق مدرس دارالعلوم ندوۃ العلماء سفر حج پر جاتے ہوئے ممبئی پہنچ کر اچانک شدید بیمار ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کی رحمت میں پہنچ گئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔

☆ ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی کے بزرگ جناب مسعود قدوائی صاحب کا (جو مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے بھائی تھے) ۱۳ر جنوری ۲۰۰۳ء کو رائے بریلی میں انتقال ہوگیا۔ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے تدفین میں شرکت فرمائی اور مرحوم کے پسماندگان و اعزہ کی تعزیت فرمائی۔ تدفین تھیولینڈی میں عمل میں آئی۔

☆ لکھنؤ (چوک) گنبد بیلس کے مالک حاجی عبدالرؤف خاں کے چھوٹے بھائی جناب حاجی محمد سلیم خاں صاحب کا مختصر علالت کے بعد ۱۲ر جنوری کو انتقال ہوگیا۔ ادارہ مرحوم کے برادر بزرگ جناب حاجی عبدالرؤف خاں صاحب اور مرحوم کے جملہ پسماندگان سے اظہار تعزیت کرتا ہے اور ان سب کے غم میں شریک ہے۔

☆ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب پالنپوری اچانک شب جمعہ ۱۷ر جنوری ۲۰۰۳ء کو بیمار ہوگئے مولانا پالنپوری کا گجرات مہاراشٹر اور ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ افریقہ وغیرہ میں بھی ارادت مندوں کا ایک بڑا حلقہ ہے۔

☆ ۱۹ر جنوری ۲۰۰۳ء کو خاتون منزل لکھنؤ میں مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی برادر زادی وفات پاگئیں، مرحومہ حکیم عبدالقوی دریابادی کی بہن اور مولوی نعیم الرحمان ندوی کی دادی تھیں۔

☆ مشہور ادیب و شاعر ولی شاہجہان پوری سابق مدیر ''پیام تعلیم'' کے بیٹے سید نثار احمد ولی وفات پاگئے، جو ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہوکر مسوری فتح پور میں آباد ہوگئے تھے مختصر علالت کے بعد لکھنؤ میں انتقال ہوگیا اور مسوہ میں تدفین عمل میں آئی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

قارئین سے جملہ مرحومین کے لئے مغفرت وبلندیٔ درجات اور ان کے پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کی درخواست ہے۔

Resi : 2268177
Mobile : 9415002535
Shop : 2213736
2500667

سونے اور چاندی کی دنیا میں ۷۵ رسالہ دیرینہ نام

حاجی صفی اللہ جیلرس

ہمارا نیا شوروم

گڑبڑجھالہ کے سامنے امین آباد لکھنؤ

پروپرائٹر : محمد اسلم

Haji Safiullah
Jewellers

Opp. Gadbad Jhala, Aminabad, Lucknow.-18

Shop: 260890
Resi: 269562

MOHD. IRFAN
PROPRIETOR

NEW KAREEM JEWELLERS

نیو کریم جیولرس

دوکان نمبر ابلد مارکیٹ ایک مینارہ مسجد کے سامنے اکبری گیٹ لکھنؤ

مئو کا بنا تیز اثردار افضلس نورانی تیل

لیبل وکیپ پر AFZALS
اور MAU CITY دیکھ کر خریدیں

بدن کے ہر قسم کے درد، زخم، چوٹ، ورم، سوزش کے امراض نیز چوں کی بہت سی دماریوں مثلاً حلقہ، فتنہ کھاسی، نزلہ وزکام وغیرہ میں مجرب ومفید ہے۔

INDIAN CHEMICAL CO. NEW CHEMICAL CO.
Mau Nath Bhanjan- Mau- 275101 (U.P.)

91-512-2462039
2462311
Resi: 2451177

Paradise

LEATHER FINISHERS

Manufacturers & Suppliers Of Finished Leather & Leather Goods

MIG-37,K.D.A.Colony,Jajmau KANPUR-208010

E-Mail:
PLFsajid@Radiffmail.com
PLFsajid1@ Datainfosys.net

پھر ہمیں خود اپنے اوپر غصہ کیوں نہیں آتا؟

فارسی کے مشہور شاعر مرزا بیدلؔ کی خدمت میں دور دراز سے ایک وفد عقیدت مندانہ حاضر ہوا، دیکھا کہ مرزا داڑھی منڈوا رہے ہیں وفد کے سربراہ نے حیرت واستعجاب سے عرض کیا۔ ''مرزا آپ بھی داڑھی منڈواتے ہیں'' مرزا نے شوخی سے جواب دیا۔ ''ہاں! داڑھی منڈواتا ہوں، کسی کا دل نہیں دکھاتا۔'' بیدلؔ کا مخاطب بھی شاید کوئی صاحب دل ہی رہا ہو نہایت عاجزی اور بڑی دردمندی سے وہ بیدلؔ سے مخاطب ہوئے اور کہا'' ہاں، ہاں! آپ کسی کا دل نہیں دُکھاتے لیکن داڑھی منڈوا کر اور سنت کو ڈھا کر اپنے رسولؐ کے دل پہ آرے تو ضرور چلاتے ہیں!!''

دل سے نکلی یہ بات بیدلؔ کے دل پر گری لیکن بجلی بن کر نہیں ابر رحمت بن کر۔ اور انہیں پانی پانی کر گئی، حاضر جوابی اور شوخی کی جگہ ندامت وشرمندگی نے لے لی اور اس نے بیدلؔ کو ایسا بیکل کر دیا کہ داڑھی نہ منڈوانے کا فیصلہ کئے بغیر انہیں چین نہ آیا۔

بیدلؔ کے اس واقعہ کو ذرا ایک بار پھر پڑھئے، بیدلؔ کی یہ بات اگر ہمارے دل پر اثر انداز نہ ہو تو ہمیں خود کے ''بے دل'' ہونے پر شبہ نہ ہونا چاہئے!!

اب ذرا دل تھام کر اس بات کا تصور تو کیجئے کہ ہمارے اعمال حضور خیر الانامؐ کے سامنے پیش ہیں۔ الا ماشاء اللہ اعمال کی اس گٹھری میں کیا کچھ نہیں ہے جھوٹ، غیبت، خیانت، حسد، بغض، عداوت، بہتان تراشی ولاآزاری، نہ ہماری زبانوں سے کوئی محفوظ نہ ہمارے ہاتھوں سے کوئی مامون۔ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد۔ دونوں کی حق تلفی اور دونوں شکوہ سنج! ان کرتوتوں کا احاطہ کیوں کر ممکن ہو اور اس کے بیان کی تاب قلم کہاں سے لائے۔ اقبال نے اس صورتحال کی تصویر کھینچی تھی۔ ''یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود'' ایسے اعمال وکردار کو دیکھ کر رسول اللہ کے دل پر کیا کچھ نہ گزرتی ہوگی!! اور شفیع اعظمؐ کے دل پر کیسی چوٹ پڑتی ہوگی۔!!

کسی بدبخت کی جانب سے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے پر ہماری غیرت جوش میں آجاتی ہے اور بلاشبہ اسے جوش میں آنا ہی چاہئے حضرت امام مالکؒ سے خلیفہ ہارون رشید نے اہانت رسول کا ارتکاب کرنے والوں کے بارے میں دریافت کیا تھا تو انہوں نے جواب میں فرمایا تھا کہ اس ملت کی زندگی کیا ہے جس کے پیغمبر کو گالیاں دی جائیں۔ اہانت رسول کو برداشت کرنا جرم عظیم اور ایمان کے عین منافی! لیکن خدارا اس حقیقت پر بھی تو ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھانے کے مجرم ہم بھی تو ہیں!! بس اس فرق کے ساتھ کہ گستاخانِ رسولؐ زبان وقلم سے اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں اور ہم اپنی غفلتوں اور اس سے آگے بڑھ کر بداعمالیوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قلبی اذیت کا باعث بنتے ہیں۔ پھر ہمیں خود اپنے اوپر غصہ کیوں نہیں آتا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اذیت کے پہونچانے سے بچ جانے کی کوئی تدبیر بھی آپ کے ذہن میں آتی ہے؟ کون نہیں جانتا کہ آپ کو خراج عقیدت کے ساتھ ساتھ خراج اطاعت اور خراج اتباع پیش کرنا ہی اس مسئلہ کا حل ہے۔ لیکن سوال اس کا ہے کہ اپنے پرانے پاپی من کو کس طرح اس طرف راغب کیا جائے اور غفلتوں کے عادی اندرون کو کس طرح خیر کی طرف مائل کیا جائے۔ خوف خدا، آخرت میں باز پُرس، جنت کی نعمتیں، دوزخ کی اذیتیں، دنیا میں بھی اچھے اعمال پر رب کریم کا فضل وعنایت اور برے اعمال پر یہاں بھی پکڑ وگرفت۔ اس طرح کے عقائد اور احساسات حضرت انسان کے اعمال پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ جن خوش نصیبوں کو اس کا تجربہ ہے وہی اس کی لذت محسوس کر سکتے ہیں کہ ان احساسات کی بدولت کس طرح انہوں نے بدیوں کو شکست دی اور کس طرح ان پر نیکیوں کے دروازے کھلتے چلے گئے۔

اعمال پر اثر انداز ہونے والے عوامل و محرکات میں اس احساس کو بھی شامل کر لیجئے کہ ہمارے اعمال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں جس امت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پتھر بھی کھائے ہیں اور پیٹ پر پتھر بھی باندھے، اب اس امت کے فرد ہونے کے ناطے فیصلہ خود کیجئے ہمارے اعمال رسول اللہؐ کے لئے راحت کا باعث بنیں یا خدانخواستہ اذیت وتکلیف کا۔ بھلا کون بدبخت ہوگا جو اپنے رسولؐ کو اذیت پہونچانے کا تصور بھی کر سکے گا۔

روزمرہ کی زندگی میں اخلاقی قدروں کے زوال کے باوجود آج بھی یہ پاس ولحاظ دیکھنے کو مل جاتا ہے کہ ہماری کسی کوتاہی یا لغزش کا علم کسی ایسی شخصیت کو نہ ہونے پائے جس سے ہمارا عقیدت ومحبت کا تعلق ہے۔ کیا رسول مقبولؐ کی ذات اقدس سے بڑھ کر بھی عقیدت ومحبت کا حقدار کوئی ہو سکتا ہے۔ تو پھر اس سلسلہ میں کوتاہی کیسی؟ خدا کا شکر ہے کہ اپنے رسول سے محبت تو اس امت کا طرہ امتیاز ہے یہاں تک کہ ایک فاسق وفاجر مسلمان کا دل بھی محبت وعشق رسول سے خالی نہیں ہے۔ لیکن بس خامی یہ ہے کہ ہمارے اعمال محبت رسول کے تقاضوں سے خالی ہیں۔

''رسول کا دل دکھانے کے مجرم ہم بھی تو ہیں۔'' کا احساس اپنے اندر جگائیے، اس صورتحال کو بدل دینے کا فیصلہ کیجئے اور پھر اس کے ثمرات وبرکات دیکھئے کہ یہ احساس کس طرح ہمارے لئے ''ریموٹ کنٹرول'' کا کام دے گا اور ہمیں نیکیوں سے رغبت اور برائیوں سے نفرت دلانے کا موجب بنے گا۔ جس لمحہ یہ احساس ہم میں جاگ اٹھے گا، ہم بھی مرزا بیدلؔ کی طرح بیکل ہو اٹھیں گے اور دل کی کایا پلٹ جانے اور من کی دنیا بدل جانے میں انشاء اللہ دیر نہ لگے گی۔

(امین شجاع)